کتاب نما کا خصوصی شمارہ

حنیف ترین

(فن اور شخصیت)

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

حنیف ترین

(فن اور شخصیت)

مرتبہ

سہیل انجم

ماہنامہ کتاب نما۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

اڈیٹر	:	شاہد علی خاں
مہمان اڈیٹر	:	سہیل انجم
فی شمارہ	:	10/
سالانہ	:	100/-
سرکاری اداروں سے	:	150/-
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی جہاز)	:	20 امریکی ڈالر یا 14 پونڈ

اس شمارے کی قیمت: 175

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025.

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، (ایر کنڈیشنڈ) بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی۔110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ۔202002

پہلی بار: جون ۲۰۰۴ء تعداد: 500 قیمت: -/175 روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی

فہرست

شخصی اور فکری تناظر

غزلیہ سیاق و سباق

نظمیہ ابعاد

عکس بیں

حرفِ تکریم

شخصی اور فکری تناظر

سہیل انجم
سب اڈیٹر روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی

جذبات واحساسات کی مٹی کو خونِ جگر سے گوندھنے، اسے شعری ہیئت واسلوب کے چاک پر چڑھانے اور پھر ایسی پیکر تراشی کرنے میں جو فن کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو جائے، برسوں کی محنتِ شاقہ اور آہِ سحر گاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شعر گوئی کا سفر شروع کرنے اور تجربات و مشاہدات کی سنگلاخ وادیوں کو عبور کرتے ہوئے منزل مراد تک پہنچنے میں ایک عمر بیت جاتی ہے، پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں، انگلیاں فگار ہو جاتی ہیں اور سراپا فکر بن جانا پڑتا ہے۔ اگر کسی شاعر نے محض دس پندرہ برسوں میں دنیائے سخن میں اپنے لیے کوئی ممتاز مقام بنالیا ہے تو یقیناً اس میں اس کا خونِ جگر بھی جلا ہوگا، وہ آہِ سحر گاہی کی تکلیف مگر وہ لذت انگیز ساعتوں سے بھی گزرا ہوگا، آبلہ پائی کی اذیتیں بھی جھیلی ہوں گی اور خونِ دل میں اپنی انگلیاں بھی ڈبوئی ہوں گی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ ڈاکٹر حنیف ترین نے شعر گوئی کا سفر کب شروع کیا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ "رباب صحرا" ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا اور چوتھا مجموعہ ۲۰۰۱ء میں جلوہ گر ہوا۔ ان کا پانچواں مجموعہ "ابابیلیں نہیں آئیں" حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ اور ان دس بارہ برسوں میں حنیف ترین نے صحرائے عرب کے ریگستانوں سے لے کر برصغیر کے ادبی حلقوں اور رسالوں و جریدوں میں اپنے لیے جو مقام متعین کر لیا ہے یا کرالیا ہے، وہ بہتوں کے لیے قابلِ رشک بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

اس وقت ہندوپاک کا شاید ہی کوئی ایسا ادبی جریدہ اور سیاسی رسالہ ہو جس میں حنیف ترین کی تخلیقات شائع نہ ہوتی ہوں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ نصف درجن سے زائد رسائل و جرائد ان پر خصوصی گوشے اور خصوصی شمارے شائع کر چکے ہیں اور تقریباً اتنے ہی مجلات ان کے فن پر خصوصی شمارے شائع کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں جب حنیف ترین نے اپنا پہلا شعری مجموعہ "رباب صحرا" لے کر ادبی حلقوں میں انٹری لی تھی تو ان کے افکار و انداز پر

بیشتر لوگ چونک پڑے تھے اور انہوں نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ اگر اس شاعر کی فکری اٹھان اور خیالات کی پرواز یہی رہی اور اس نے اپنے مطالعہ کو مزید وسعت دی تو آگے چل کر اس پہلے مجموعہ کی اساس پر اچھی شاعری کی مستحکم عمارت تعمیر ہو گی۔ آج صورت حال کچھ یوں ہے کہ حنیف ترین کی شاعری نقادوں کی توجہ کا مرکز بن گئی ہے اور جہاں وہ اپنا شعری جہان تخلیق کر رہے ہیں وہیں اس کے متوازی ان کی شاعری کا محاکمہ بھی جاری ہے اور فن کی کسوٹی پر اسے کسنے کا عمل مسلسل چل رہا ہے۔ کسی نے ان کی شاعری کو "انفرادی راہ" قرار دیا تو کسی نے انہیں "ہوشمند، درد آشنا اور حساس شاعر" بتایا ہے۔ کسی ناقد نے انہیں "گہرے تجربے کا شاعر کہا ہے تو کسی نے علامتوں اور استعاروں کے استعمال کو ان کی خوبی گردانا ہے۔" کسی نے ان کی تخلیقات کو "استعاراتی صنم سازی" کہا ہے تو کسی ناقد نے ان کے کلام میں "تازگی، امنگ، شائستگی اور ٹھہراؤ" دیکھا ہے۔ کسی کو ان کے "احساس واظہار دونوں میں نیا پن" نظر آتا ہے تو کسی کے خیال میں وہ "شعر کہتے نہیں شعر جیتے ہیں"۔ کسی نے انہیں "انقلابی شاعری کا علم بردار" بتایا ہے تو کسی ناقد کو ان کی شاعری "سراپا انتفاضہ" نظر آتی ہے۔ گویا حنیف ترین کا کلام نقادوں کی گراں قدر توجہ نہ صرف اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہے بلکہ وہ نقادوں کو مجبور بھی کرتا ہے کہ وہ اس پر اظہار خیال کریں۔

ڈاکٹر حنیف ترین کا پہلا شعری مجموعہ "رباب صحرا" ۱۹۹۲ء میں، دوسرا "کتاب صحرا" جنوری ۱۹۹۵ء میں، تیسرا "کشتِ غزل نما" جنوری ۱۹۹۹ء میں چوتھا "زمین لاپتہ رہی" فروری ۲۰۰۱ء میں اور پانچواں ابابیلیں نہیں آئیں ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ اسی درمیان انہوں نے فلسطین میں جاری انتفاضہ پر ایک ایسی طویل نظم کہی ہے جسے فلسطینیوں کی جدوجہد آزادی، ان کی جاں نثاری وجواں مردی اور آزادی کی خاطر اپنی جانوں تک کا نذرانہ پیش کر دینے کے جذبے کے تناظر میں ایک شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ "باغی سچے ہوتے ہیں" ایک ایسی نظم ہے جو فلسطینی جیالوں کی جنگ آزادی کا المیہ بھی ہے اور طربیہ بھی---- بہر حال مذکورہ پانچوں مجموعوں کا اگر مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ حنیف ترین نے شاعری کے گلزار میں ایک طویل ترین سفر طے کیا ہے۔ خیال وفکر کے گھوڑے پر سوار ہو کر تجربات ومشاہدات کی خاردار وادیوں کی بادیہ پیمائی کی ہے۔ قیس وفرہاد کی مانند محبت کے سچے جذبے کے سہارے صحرا نوردی اور کوہکنی بھی کی ہے اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بوسنیائی مسلمانوں

کی زندگی کو اپنے اندرون میں اتارا ہے تو فلسطینی باغیوں کے جذبہ حریت سے اپنے لہو کی حرارت بڑھائی ہے۔

حنیف ترین ایک پرجوش اور انقلابی شاعر کا نام ہے۔ ایک ایسا شاعر جو اپنی ذات کی کشمکش سے سفر کرتا ہوا کائنات کے مطالعات و مشاہدات تک جاتا ہے۔ جو ظالم اور مظلوم، غریب اور سرمایہ دار، جھوٹ اور سچ اور حق اور باطل کی کشمکش کو اپنی فکر کی گہرائیوں، گیرائیوں میں اتارتا ہے اور انہیں شعری قالب میں ڈھال کر ایک نئی کائنات تخلیق کرتا ہے۔ رباب صحرا سے زمین لاپتہ رہی تک شاعر خیال و فکر کی مختلف منزلوں سے گزرا ہے۔ پہلے مجموعہ میں جہاں اپنی ذات کا کرب، غریب الوطنی کا کرب اور صحرائی روز و شب میں تنہائی کا کرب نظر آتا ہے وہیں آخری مجموعہ تک آتے آتے ان کے تخیلات کی بلندی یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ تہذیبوں کا ٹکراؤ، عالمی کشمکش، متعدد ملکوں میں حق و باطل میں تصادم، نیو ورلڈ آرڈر، ترقیات زمانہ کے طفیل میں انسانیت کی زوال پذیری، بارود، بم، دھماکے، شعلے اور تہذیبوں کی تباہی و بربادی ان کے کلام کے اجزائے ترکیبی بن جاتے ہیں۔

باغ میں کوئل کوک لگائے
جامن، آم پہ مستی چھائے
رستوں، پینڈوں، تالابوں میں
مینڈک اچھلیں شور مچائیں
شام سویرے پاگل جھینگر
گیت بڑے من موہک گائیں
میں تنہا ہوں صحراؤں میں
میرے چاروں جانب
ایسے پیڑ اُگے ہیں
جن پہ پیلے پھل لٹکے ہیں
گھر کا آنگن یاد آتا ہے
جب جب ساون یاد آتا ہے

یہاں سے شعری سفر شروع ہوتا ہے اور تہذیبوں کی بربادی سے منسوب ترقیات زمانہ

کی ''خطرناک نعمتوں اور برکتوں'' تک جاتا ہے۔

یہ ڈش اینٹینا پردے پر سجا کر روز لاتا ہے
بلیو فلمیں
علی الاعلان دنیا کو دکھاتا ہے
(مرے اندر کے انساں کو جلاتا ہے چڑاتا ہے)
نیا کلچر عطا کرنے کی کوشش میں
سریلے گیت گاتا ہے
تباہی جو تھی ہم سے دور
اسے نزدیک لاتا ہے
یہ ڈش اینٹینا راتوں میں جگاتا ہے
یقیناً چھین کر اک دن یہ تہذیب وتمدن کو
ہلاکت خیزیوں کی اک نئی بنیاد رکھے گا
زمانے بھر کو پھر حیواں بنا دے گا

کتاب صحرا میں حنیف ترین کی ایک نظم یوں شروع ہوتی ہے:

دردِ جہاں آنکھوں میں سمیٹے
گرد آلود بال بکھیرے
رہتا ہوں چپ چاپ اکیلے
دور یہاں صحراؤں میں

لیکن یہ سفر جب کشت غزل نما تک پہنچتا ہے تو یوں منظر نگاری ہوتی ہے:

ہنگامہ بپا ہو گا خود چاند کے صحرا میں، خوشبو کے شبستاں میں
پہنچے گی جو بستر پر، بے خواب دریچوں سے، ڈر جائے گی تنہائی

چاہا تھا حنیف اس کو خود دل سے بھلا دینا ہر غم کو مٹا دینا
تنہائی کی بانہوں سے، لیکن مجھے پھر اس کی تصویر نظر آئی

اور پھر ''زمین لاپتہ رہی'' کے یہ دو شعر:

اداسیوں میں ڈوبی ہو تو، سرد سرد رات میں

حنیف ترین

کسی کی گرم یاد کو ذرا لحاف کیجئے
بچا کے خود کو، دردِ نارسائی کے ہجوم سے
حنیف دل کی وحشتوں میں اعتکاف کیجئے

تنہائی کا کرب پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے لیکن جو تنہائی پہلے شاعر کے حواس پر مایوسی طاری کر دیتی تھی اور شاعر دور صحراؤں میں چپ چاپ زندگی بسر کرنے کا گلہ کرتا تھا وہی تنہائی آگے چل کر بے خواب دریچوں سے بستر تک پہنچتے پہنچتے خود ڈر اور سہم جاتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تنہائی کی بانہوں میں محبوب کا سراپا روشن ہوتا ہے اور ایسی کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں کہ شاعر محبوب کو فراموش نہیں کر پاتا۔ یہ روشنی شاعر کو جینے کا حوصلہ بخشتی ہے اور زندگی کو جوش و جذبات سے بھر دیتی ہے۔ شاعر فکر کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے جب آگے بڑھتا ہے تو سرد سرد راتوں میں بھی اس پر مایوسی اور اکیلے پن کی کیفیت طاری نہیں ہوتی بلکہ وہ محبوب کی گرم گرم یادوں کو لحاف بنا کر اداسیوں اور سردیوں پر قابو پا لیتا ہے۔ گرم یاد کو لحاف بنانا ایک انوکھی اور نئی ترکیب ہے۔ یہ ترکیب نئے پن کا احساس بھی دلاتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ شاعر کے گنجینۂ الفاظ میں ایک سے ایک درخشاں موتی موجود ہیں، جو انتہائی قیمتی ہیں۔ لیکن ذرا یہ تو دیکھئے کہ تنہائیوں سے گزرتے ہوئے شاعر معرفت کے کس مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ خود کو دردِ نارسا کے ہجوم سے بچانا اور دل کی وحشتوں میں اعتکاف کرنا ایک ایسا پاکیزہ اور طاہر و مطہر خیال ہے جو خونِ جگر سے پرورش پاتا ہے اور جسے چوم لینے کو دل چاہتا ہے۔

حنیف ترین ایک زود گو شاعر ہیں اور بہت قلیل عرصے میں انہوں نے شاعری کے طویل قدو قامت نکالے ہیں۔ بعض ناقدین کہتے ہیں کہ زود گوئی اور بسیار گوئی اچھی چیز نہیں۔ جو لوگ بہت زیادہ لکھتے ہیں وہ بہت اچھا نہیں لکھتے۔ محض قافیہ پیمائی کرتے ہیں۔ لیکن حنیف ترین اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کی شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ زود گو اور بسیار گو ہیں لیکن جب غیب سے مضامین کے ہجوم کی یلغار ہوتی ہے تو حنیف ترین کا قلم رکتا نہیں ہے۔ وہ صفحہ قرطاس پر برق رفتاری سے دوڑنے لگتا ہے۔ ہجوم خیالات کی یلغار بعض اوقات ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے کہ شاعر راستے کی مسافتوں کو پھلانگتا ہوا بہت آگے نکل جاتا ہے اور جب ذرا دم لیتا ہے تو ان چیزوں پر بھی نظر ڈالتا ہے جن کو وہ اشتیاقِ سفر میں نظر انداز کر چکا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر وہ کسی خیال کا آخری حصہ پہلے منظوم کر دیتا ہے اور پہلا حصہ بعد میں۔

مثال کے طور پر کتاب صحرا میں ایک نظم ہے "سچے باقی رہ جاتے ہیں" اور فلسطین میں جاری انتفاضہ اور خود کش دھماکوں پر ان کی شاہکار نظم کا عنوان ہے "باغی سچے ہوتے ہیں"۔ گویا بظاہر ترتیب الٹ گئی ہے۔ لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے حق پرستوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہیں کوئی مٹا نہیں سکتا وہ فنا نہیں ہو سکتے سچے بھی ہمیشہ رہیں گے اور حق بھی ہمیشہ غالب ہو کر رہے گا۔ پھر وہ فلسطینی جیالوں کی طرف آتے ہیں اور جن کو دنیا کی ایک بڑی آبادی "باغی اور دہشت گرد" کہہ رہی ہے ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اپنی عزت و ناموس کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دینے والے باغی نہیں ہو سکتے۔ وہ سچے اور حق پرست ہیں اور باطل پر حق غالب آکر رہتا ہے اور حق کا پرچم بلند کرنے والے کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔

حنیف ترین کا پہلا مجموعہ غزلیہ ہے مگر اس کے بعد انہوں نے نظم گوئی کی طرف رجعت کی ہے۔ جن لوگوں نے پہلا مجموعہ دیکھ کر یہ رائے دی تھی کہ حنیف ترین بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ان کو اب اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔ حنیف ترین غزل گو بھی ہیں اور نظم گو بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جتنی خوبصورت غزلیں کہی ہیں اتنی ہی اچھی نظمیں بھی کہی ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے شاعری میں نئے نئے تجربات بھی کیے ہیں اور اپنے استاد ظہیر غازی پوری کی ایجاد کردہ نئی صنف سخن غزل نما سے متاثر ہو کر بہت تیزی کے ساتھ غزل نما بھی کہے ہیں اور خوب کہے ہیں۔ غزل نما میں انہوں نے جہاں اس کی فنی بند شوں اور ہیئتی لوازمات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے وہیں خیال و فکر کے گھوڑے بھی خوب دوڑائے ہیں۔ حنیف ترین کے مجموعہ کشتِ غزل نما پر رائے زنی کرنے سے میں گریز کر رہا ہوں۔ ظہیر غازی پوری نے اس سلسلے میں اپنے مضمون میں خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے اور سچی بات یہی ہے کہ اس پر اظہار خیال کرنے کا حق انہی کو ہے۔

"کتاب صحرا" نظموں پر مشتمل ہے۔ اس میں بعض نظمیں انتہائی مختصر ہیں۔ محض تین چار الفاظ کا ایک مصرعہ اور تین مصرعوں کی ایک نظم۔ مگر نظم پوری طرح مکمل۔ ایسی نظموں میں انہوں نے کسی خیال کو بڑی فنی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ "حنیف ترین نے تین مصرعوں کے علاوہ چار پانچ اور سات مصرعوں میں بھی نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں میں چونکہ ارتکاز ہے اور بات کو گہرائی میں جا کر کہا گیا ہے اور

امیجری بھی خوبصورت ہے اس لیے یہ نظمیں بہت کامیاب ہیں۔"

مٹی کے گھروندوں میں
ننھے منے ہاتھوں کے
خواب جھلملاتے ہیں----(بچپن)
ننھی داستانوں میں
بچہ الجھا رہتا ہے
خواب کی دوکانوں میں----(بچپن)
خواہشوں کے جنگل میں
کھیل کالے جادو کا
آگ سی لگاتا ہے
جب شباب آتا ہے----(جوانی)

لیکن چوتھے مجموعہ "زمین لاپتہ رہی" میں اس قدر مختصر نظمیں نہیں بلکہ انتہائی طویل نظمیں ہیں۔ "اک خیال آتا ہے" ۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح "پردیسی جب گھر لوٹا تھا" بھی ایک طویل نظم ہے۔ اول الذکر میں شاعر خیالات کے مختلف مرحلوں سے گزرتا ہے اور ان کو اس خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتا ہے کہ پوری نظم قاری پر ایک کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ وطن سے دور بغرض ملازمت سعودی عرب کے ریگستانوں میں ایک اسپتال میں پہنچنے سے لے کر غریب الوطنی کا کرب، دیارِ غیر کے قواعد و قوانین، سرمایہ داروں کی انا پرستی، دولت کی بارش، لیبیا، اقوام متحدہ، جارج بش، کعبہ اور مدینہ، زندگی کی بے یقینی، کشمیر کی خوبصورت وادیاں، اور پھر وحشتوں کا حوصلہ اور آدمیت کا خون اور نفرت پر محبت کی جیت کی خواہش۔ اس نظم میں پوری کائنات پیوست ہے۔

نظموں کی مانند ان کی غزلیں بھی قاری کو اپنی جانب کھینچتی ہیں۔ بعض غزلیں اتنی سادہ و پرکار اور عام فہم ہیں کہ سیدھے سیدھے دل میں اتر جاتی ہیں۔ وہ جذبات و احساسات کو الفاظ کا ایسا خوبصورت پیکر عطا کرتے ہیں کہ بس پڑھتے جائیے۔ ان میں معانی و مفاہیم کی ایک دنیا آباد ہونے کے ساتھ ساتھ غنائیت اور نغمگی بھی بلا کی ہے۔

تمہیں جب ڈسے کبھی چاندنی، مجھے پڑھنا تم مجھے لکھنا تم
کبھی چھائے جب گھٹا جامنی، مجھے پڑھنا تم مجھے لکھنا تم
جو چلے گئے ہمیں چھوڑ کر نئے سورجوں کی تلاش میں
وہ بکھیریں جب نئی روشنی مجھے پڑھنا تم مجھے لکھنا تم

میرے لفظوں میں روانی اور ہے
درد دل کی یہ کہانی اور ہے
دیدنی ان ریشمی لمحات کی
لمسِ مخمل سائبانی اور ہے

زخم ہرا جب ہووے گا کل پرسوں میں
سارا عالم چہکے گا کل پرسوں میں
خواب کا خیمہ نور کی چادر سے ڈھک کر
ہر بنجارہ چل دے گا کل پرسوں میں

ڈاکٹر حنیف ترین خواب کے نہیں بیداری کے شاعر ہیں۔ زندگی کی حقیقتوں، سچائیوں، تلخیوں اور کڑواہٹوں کو نظم کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ دنیا کے حسن اور زندگی کی خوبصورتی کو بھی پیکر شعر میں ڈھالتے ہیں۔ خیالی جنت میں رہنے کے بجائے تلخ حقیقتوں کی سنگلاخ زمین پر قدم جما کر چلنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ خوابوں میں ڈوبے رہنے کے بجائے حالات کا مقابلہ کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔ خواہ وہ حالات کتنے ہی سفاک اور ظالم کیوں نہ ہوں۔ زندگی کے حسن کے ساتھ ساتھ اس کے قبح سے بھی آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ بوسنیا، فلسطین اور کشمیر پر ان کی نظمیں یوں ہی صفحۂ قرطاس پر نہیں اتر آئی ہیں۔ حنیف ترین نے ان حالات کو اپنے اندرون میں جیا ہے اور سفاکیوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ چونکہ وہ سعودی عرب کے عرعر میں قیام پذیر ہیں جو کہ ایک سرحدی مقام ہے، لہٰذا مغربی ایشیا کے خون چکاں واقعات اور دردانگیز تاریخ کے اوراق ان کی شاعری میں بکھرے پڑے ہیں۔ انھوں نے فلسطینی جاں بازوں کو بھی بہت قریب سے دیکھا ہے اور عراق پر فوج کشی کے عبرتناک مناظر سے بھی دو

چار ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کے خیالات واحساسات میں فطری طور پر ایک جوش در آیا ہے اور ان کی شاعری درد و کرب کا استعارہ بننے کے ساتھ ساتھ انقلاب کی بھی علامت بن گئی ہے۔

جو لوگ ڈاکٹر حنیف ترین سے بالمشافہ ملاقات کر چکے ہیں اور ان کے ساتھ دو چار گھنٹے اور دو چار دن گزار چکے ہیں وہ اس کی گواہی دیں گے کہ عالمی کشمکش نے ان کے ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ مسلمانوں کی مظلومیت اور صہیونیوں کی بربریت نے ان کو تڑپایا ہے اور ان کے قلم کو مہمیز لگائی ہے اور انہوں نے یہ سبق سیکھا ہے کہ ظالموں کی کلائی مروڑنے کے لیے طاقت کی ضرورت ہے اور جب تک مسلمان اپنے اندر طاقت و قوت پیدا نہیں کریں گے یوں ہی پٹتے اور کٹتے مرتے رہیں گے۔ ان کے انہی اوصاف اور انہی جذبات واحساسات کی بنا پر میں ان کو ایک انقلابی شاعر سمجھتا ہوں۔ ایک ایسا شاعر جو اسلام کو سربلند دیکھنا چاہتا ہے اور مسلمانوں کی عزت و ناموس کے تحفظ کا خواب دیکھتا رہتا ہے۔ حنیف ترین کی ذات میں ایک ایسا طوفان موجزن ہے جو انہیں کسی کل چین نہیں لینے دیتا، جو انہیں پھرکی کی مانند نچائے رکھتا ہے۔ یہ طوفان ان کا قیمتی سرمایہ ہے، جس دن یہ طوفان ٹھنڈا پڑ گیا یا اس پر وقت اور حالات کے جبر نے بند باندھ دیا، اس دن حنیف ترین نامی شاعر گمنامی کے غار میں ڈوب جائے گا۔

حنیف ترین اردو زبان کے بھی دیوانے اور شیدائی ہیں۔ یہ درحقیقت صحرائے عرب میں اردو کے نخلستان ہیں۔ ہفتہ وار اور ماہانہ شعری نشستوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ انہوں نے عربستان میں نخلِ اردو کی آبیاری کی ہے جس کی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ وہ شعری نشستوں کا اہتمام اپنی جیب سے کرتے ہیں اور کسی بھی اردو دوست کو زیر بار نہیں ہونے دیتے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے عرعر میں اردو کی کوچنگ بھی شروع کر رکھی ہے۔ اپنے اخراجات پر اردو کتابوں اور اسٹیشنری کا انتظام کرتے ہیں اور اردو سے نابلد لوگوں کو اردو زبان سکھاتے اور پڑھاتے ہیں۔ چونکہ عدیم الفرصت ہیں اس لیے خود کلاس نہیں لیتے بلکہ استاد رکھتے ہیں اور اپنی جیب سے اسے معقول معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ اب تک انہوں نے سیکڑوں شعری نشستوں کا اہتمام کیا ہے اور ہزاروں لوگوں کو اردو سکھائی اور پڑھائی ہے۔ گویا انہوں نے صحرائے عرب میں اردو کا باغ لگایا ہے جس کی چھاؤں میں بے شمار افراد دم لے رہے ہیں۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے کتاب نما کے خصوصی شمارے کے اہتمام کی ذمہ داری خاکسار کو سونپی ہے (حالانکہ میں خود کو اس کا اہل نہیں پاتا) دہلی اور بیرونِ دہلی بے شمار اردو داں حضرات ان کے حلقہ بگوش ہیں جن میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور پروفیسر حضرات بھی شامل ہیں۔ جس کسی کو بھی کہتے وہ یہ ذمہ داری خوشی خوشی قبول کر لیتا۔ لیکن جانے کیوں انہوں نے یہ ذمہ داری مجھے سونپی۔ (میں اس کے لیے ان کا مشکور و ممنون ہوں)۔ کتاب نما کا یہ خصوصی شمارہ بہت پہلے آجانا چاہیے تھا لیکن میری عدیم الفرصتی آڑے آتی رہی اور میں اس کے اہتمام و انتظام کے لیے وقت نکالنے سے قاصر رہا۔ بہر حال یہ خصوصی شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے حسن و قبح کے بارے میں فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔
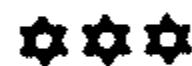
جناب آئی کے گجرال
سابق وزیر اعظم ہند

رباب صحرا کے اجراء کے موقع پر سابق وزیر اعظم ہند کی تقریر کا اقتباس

جناب راج بہادر گوڑ صاحب اور دیگر معزز حاضرین!

میرا یہ خوش گوار فریضہ ہے کہ میں ڈاکٹر حنیف ترین صاحب کو ان کے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد دوں۔ میرا ان سے رشتہ پرانا ہے۔ آج انھوں نے اس کی تجدید بھی کی اور مجھے یاد دلایا کہ میں سیاسی چکروں میں ان جیسے جانے کتنے عزیزوں سے دور ہو گیا ہوں۔ حنیف صاحب نے ۱۹۷۰ء کا ذکر کر کے جانے کتنی یادوں کو تازہ کر دیا اور مجھے میری عمر کا احساس بھی دلا دیا جو بے پاؤں بھاگی جا رہی ہے۔ میں ۱۹۷۰ء کے حنیف خاں کو جانتا ہوں، اب انھوں نے کرم فرمائی کی کہ مجھے اپنی کتاب کے مطالعے کا موقع فراہم کیا۔ کتاب کے مطالعے نے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۷ء تک میرے اور حنیف صاحب کے درمیان پیدا ہو گئے Time gape کو پورا کر دیا اور میں کتاب کے ذریعے اس حنیف کو جان پایا جس سے میں ان ستائیس سالوں میں مل نہیں پایا تھا۔ یہ کتاب حنیف صاحب کے ذہن دل کا آئینہ خانہ ہے۔ حنیف کی بوسیدہ اچکنیں اس علی گڑھ تہذیب کی علامت ہیں جس میں حنفی کے ذہن و ذوق کی تربیت ہوئی، علی گڑھ کی بوسیدہ اچکنوں میں علمی تہذیب کی ایک پوری روایت پنہاں ہے۔ آکسفورڈ میں بوسیدہ اچکنوں کی جگہ وہ گاؤن لے لیتا ہے جس کا پرانا پن یا حنیف صاحب کے شاعرانہ لفظوں میں کہوں تو بوسیدگی اس کی عظمت کی علامت ہوتی ہے۔ جب آکسفورڈ میں لکھتے ہیں تو پڑھنے اور پڑھانے والے اپنے جس روایتی گاؤن کو پہن کر جاتے ہیں اس کی بوسیدگی ان کی سینئرٹی (Seniority) کی علامت ہوتی ہے۔ جس گاؤن میں جتنے زیادہ سوراخ ہوتے ہیں اس کے پہننے والے کی عظمت اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ آج اگر حنیف صاحب بھی علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی کی کسی ایسی بوسیدہ اچکن کو پہن کر آتے تو اس کی بوسیدگی یا سوراخ بھی ہمیں ان کی عظمت اور Seniority کا پتا دے دیتا۔

بوسیدہ اچکنوں میں چھپی آن بان ہوں
میں بھی کسی عروج کا مٹتا نشان ہوں

شاعری خواہ کسی زمانے کی ہو، جب تک وہ وقت کے تقاضے پورے نہیں کرتی اس کی عظمت

کا سفر شروع نہیں ہوتا۔ حنیف صاحب کی شاعری اردو شاعری پر گذشتہ کچھ برسوں سے چھائے ہوئے جمود کو توڑنے کی کامیاب کوشش ہے۔ ان کے تجربے کی پختگی اور دشت نوردی بلکہ صحرا نوردی نے اس کتاب کو وقت کے تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ کر دیا ہے۔

کتاب صحرا کو انھوں نے شاید جمود توڑنے کی کوشش کے Symbol کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک جب شروع ہوئی تو میں کالج میں پڑھتا تھا۔ اس تحریک کی کامیابی کی اصل وجہ یہی تھی کہ اس سے وابستہ لکھنے والوں نے وقت کے تقاضے کو پہچانا تھا۔ ہم جس دور میں زندہ ہیں اس کی رفتار اتنی زیادہ تیز ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اگر وقت سے ہم آہنگ نہ رہا جائے تو بوسیدگی طاری ہونے لگتی ہے۔ شاعری اور نثر جب تک تیزی سے بدل رہی زندگی اور وقت کی تیز رفتار سے ہم آہنگ نہیں ہوں گے، اس کا relevance قائم نہیں رہ پائے گا۔

حنیف صاحب کی شاعری میں وقت کے تقاضوں کو پہچاننے اور ان سے ہم آہنگ ہونے کی شدید جستجو کا پتا ملتا ہے۔ اس کے لیے انھیں جتنی مبارک باد دی جائے کم ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ آج تمام وقت میں حنیف صاحب کی شاعری پر ہونے والی گفتگو سنوں گا مگر وقت کا تقاضہ کچھ اور ہے۔ ملک میں جس طرح مذہب کے نام پر لوگوں کو لڑایا اور بھڑایا جا رہا ہے وہ ملک کی قومی زندگی کے لیے ایک خطرناک Symbol ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں زیادہ وقت نہیں دے پاؤں گا کیوں کہ مجھے ایسی ہی ایک ضروری میٹنگ میں شرکت کرنا ہے مگر جانے سے پہلے میں حنیف صاحب سے اور آپ حضرات سے معذرت چاہوں گا اور ایک بار پھر حنیف صاحب کو ان کے اس مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد دوں گا۔ شکریہ!

✪ ✪ ✪

پروفیسر گوپی چند نارنگ

حنیف ترین کی شعری کائنات

ہر ہوشمند شاعر کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ شاعری دراصل ایسی دنیا ہے جہاں زمین سخت اور آسمان دور ہے اور بہت خونِ جگر صرف کرنے کے بعد کہیں ایک مصرعۂ تر کی صورت سامنے آتی ہے۔ شاعری کے واجبات بہت شدید ہیں۔ اسی لیے کسی بھی نوجوان شاعر کو صحیح معنوں میں قدر افزائی اور قبول عام کی منزل تک پہنچنے میں وقت لگتا ہے۔ اس کے لیے اسے پیش رو اور معاصر شعرا اور ادیبوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے میں آنکھوں کا تیل ٹپکانا پڑتا ہے۔ دو یا چار برس کے پھیر میں کوئی بھی یہ طے نہیں کر سکتا کہ ادب میں اس کا مقام اور مرتبہ کیا ہوگا۔ عموماً مدتوں تک خود شاعر اپنے لیے کسی راہ کا تعین نہیں کر پاتا۔ اس کی فکر، مطالعہ اور بیان میں تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے۔ کسی نئے شاعر کے بارے میں اس کے سفر کا تجزیہ کرنے کے بعد صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس کے موضوعات، مسائل، لہجہ اور آہنگ کیا ہیں، اس کا اسلوب کیا ہے اور اس نے معانی کی جو شکلیں تراشی ہیں اس سے اس کی روایت، آگہی اور خود تجربے کرنے کی ہمت اور حوصلے کا کیا پتا چلتا ہے۔ ان میں آخر الذکر یعنی تجربے کرنے کی ہمت اور مشاہدے کی قوت سے کسی شاعر کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

جہاں تک حنیف ترین کی شاعری اور خصوصاً ان کی نظموں کا تعلق ہے تو یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ نظم نگار کی حیثیت سے ان کا مستقبل حوصلہ افزا ہے۔ اگر خود ان کی اپنی نظر ان کو نہ لگ گئی اور وہ سستی اور وقتی شہرت کے چکر میں نہ پڑے اور اپنے مطالعے اور سعی و جستجو کو جاری رکھا اور باطن کی آواز کو سن کر سخن گوئی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے رہے تو ایک کامیاب نظم نگار کی حیثیت سے ان کے مستقبل کے امکانات بے حد امید افزا ہیں۔ مگر انہیں ہر لمحے یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ اچھی شاعری کے واجبات خاصے شدید ہیں۔

حنیف ترین کا تعلق سنبھل کے ایک ایسے معزز اشراف گھرانے سے ہے جس میں کئی نسلوں سے علمی روایت پروان چڑھتی رہی ہے، اس لیے ان کو زبان پر قدرت حاصل ہے اور روایت سے ان کا رشتہ مستحکم ہے۔ یہ ان کے خاندان کی علمی روایت ہی کا فیضان ہے کہ پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی انہوں نے شاعری سے اپنا رشتہ قائم کیا۔ اس سے نہ صرف ان کی لگن، دل سوزی اور درد مندی ظاہر ہوتی ہے بلکہ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی شے ان کے باطن میں یا نفسیاتی، داخلی یا روحانی تجربے میں ایسی ضرور ہے جو ان کو شعر کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ بعض لوگوں نے ان کی شاعری کو انسانیت کی چیخ کہا ہے۔ شاعری کا منصب چیخ یا برہنہ گفتاری نہیں، شاعری انسانیت کی آواز ہے۔ واضح رہے جب تک شاعری میں انسانیت کی آواز موجود نہ ہو اس وقت تک وہ انسانیت کے لیے احتجاج کی چیخ بھی نہیں بن سکتی۔ شاعری تو بلبل کا نالہ بھی ہے اور نغمہ درد بھی ہے۔ شاعری انسانیت کی آواز بھی ہے اور جب شاعری میں سماجی درد آتا ہے تو وہ احتجاج یا طنز کا پیرایہ اختیار کرتی ہے۔ ان تمام احساسات اور تصورات کے مختلف تجربے حنیف ترین کے کلام میں بکھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے اپنے اولین مجموعے میں غزلیں شامل کی تھیں جن کی پذیرائی ہوئی ہے، لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ ان نظموں کے مجموعہ کتاب صحرا سے ان کی انفرادیت زیادہ کھل کر سامنے آئے گی کیونکہ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور نظم کا کینوس غزل سے زیادہ وسیع ہے۔

حنیف ترین کی امیجری اور ان کے موضوعات میں تنوع ہے ان کے تحت الشعور میں دھرتی اور آکاش کے جو رنگ ہیں، جو کھیت کھلیان ہیں، گلیاں محلے ہیں، ماحول ہے وہ سنبھل اور مراد آباد کا ہے لیکن جو صحرا ہے وہ تپتی ریت کے مسائل ہیں وہ سعودی عرب کے ہیں۔ عرب دنیا میں ایک ایشیائی کی، بالخصوص ایک ہندوستانی کی جو حیثیت ہے اس وجودی جبر کو بھی حنیف ترین نے گہرائی سے محسوس کیا ہے۔ سیاسی نظام کے فرق کو بھی محسوس کیا ہے، وطن سے دوری اور اجنبیت کو بھی۔ اور ان کے یہاں بین السطور وہ مہذب احتجاج اور درد بھی نمایاں ہوا ہے جو ان کے اپنے تشخص کی دین ہے۔ ان کی امیجری میں وہاں کی دھوپ، وہاں کی چمکتی ریت اور کھلے صحرا، اور پھر عراق اور سعودی عرب کی جنگ، ایران اور عراق کا تنازعہ، بوسنیا اور چیچنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، ان سب کی پرچھائیاں ان کی نظموں میں واضح طور پر مل جاتی ہیں۔ اپنے وطن ہندوستان کے لیے ایک نستالجیا (Nostalgia) یہاں کی مٹی کی بوباس کے لیے، یہاں کی

فضاؤں کے لیے اور یہاں کے محبت افروز رشتوں کے لیے ایک زیریں لہر کے طور پر جاری ہے۔ یہ ساری چیزیں ان کی غنائی (Lyrical) نظموں میں ہیں اور یہی ان کی نظموں کا اہم وصف ہے۔ رومانی سے زیادہ غنائی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں سوچ کی لہریں نمایاں ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "احتجاج" کوری احتجاج کی نظم نہیں بلکہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہاں، یہ سچ ہے مری کاوشوں کے طفیل
ریگزاروں میں سبزہ نکل آئے گا
اونچے پربت پہ پانی پہنچ جائے گا
بحر کی تہہ میں گھر، پارک بن جائیں گے
ماہ و مریخ پر
لہلہاتے ہوئے باغ لگ جائیں گے
گھومنے کے لیے دور بے رنگ و بے حس خلاؤں میں
تفریح کے
آدمی، فکر و محبت کی بنیاد پر
کہکشاؤں کا ہر راز
پالے گا لیکن، یہ "آج" اور "کل"
میری مٹھی میں
اب ہے نہ پہلے ہی تھا
سرد ہوتے ہوئے
خورشید کی روشنی
اس فضا میں بکھرتی رہے گی یوں ہی
اور مری سرمئی، کاسنی، نیلی، پیلی زمیں
اور بھی بوڑھی ہو جائے گی!!

کاوشوں سے کہو
میرے سورج، زمین، چاند، تاروں کے ساتھ

حنیف ترین

مجھ کو بھی بوڑھا ہونے سے اب روک لیں
زندگی ہے حسیں
قیمتی اس سے دنیا میں کچھ بھی نہیں
پھر بھی یہ زندگی
زندگی کیوں نہیں؟
دائمی کیوں نہیں!!

اس نظم کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ انسان کا بنیادی مسئلہ کیا ہے؟ وقت اور زماں کیا ہے، دکھ اور خوشی کیا ہیں، انسان خوشی پر قابو کیوں نہیں پا سکتا، انہیں اپنی مٹھی میں کیوں بند نہیں کر سکتا، انسان جو یوں تو بہت کچھ کر سکتا ہے، وہ قادر و مختار ہے۔ کارخانے، عمارتیں، بندھ بنا سکتا ہے، نہریں نکال سکتا ہے، عظیم شہر آباد کر سکتا ہے، چاند تک پہنچ سکتا ہے، خلا کو تسخیر کر سکتا ہے لیکن وقت کو یا لمحۂ حاضر کو اپنی مٹھی میں بند نہیں کر سکتا، یعنی انسان کی مجبوریاں کیا ہیں، اختیارات کیا ہیں، وہ کس حد تک خود اختیاری سے کام لے سکتا ہے اور کہاں وہ مجبور محض ہے۔ اس کیفیت کا حنیف ترین نے بڑا خوب صورت اور پوری فنکارانہ چابکدستی سے اظہار کیا ہے۔ اگر وہ اس طرح کے مسائل پر مزید توجہ کریں تو ان کی آواز میں بہت نکھار آئے گا۔

حنیف ترین نے طویل نظمیں زیادہ نہیں کہی ہیں۔ ان کے یہاں مختصر اور مختصر ترین نظمیں بھی مل جاتی ہیں مثلاً تین مصرعوں کی نظمیں جن کا پاکستان میں بہت رواج ہوا ہے اور جنہیں ثلاثیاں کہا جا رہا ہے۔ ہماری علاقائی زبانوں اور لوک ادب میں تین مصرعوں کی نظمیں اور اس طرح کے چھوٹے بڑے ٹکڑے بہت عام ہیں۔ بالخصوص سرائیکی، سندھی، پنجابی وغیرہ میں بلّھے شاہ، بابا فرید، شاہ حسین، صوفی، سنتوں اور فقیروں کے یہاں اس طرح کا کلام کافی ملتا ہے۔ آج کے دور میں ہائیکو کے اثر سے بھی تین مصرعوں یا ان سے کم کی نظمیں کہی جا رہی ہیں۔ حنیف ترین کے یہاں بھی ایسی نظمیں خاصی تعداد میں ہیں۔ لیکن ان کا کوئی ضابطہ بند فارم نہیں ہے۔ انہوں نے تین مصرعوں کے علاوہ چار، پانچ اور سات سات مصرعوں میں بھی نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں میں چونکہ ارتکاز ہے، اور بات کو گہرائی میں جا کر کہا گیا ہے، امیجری بھی خوبصورت ہے اس لیے یہ نظمیں بہت کامیاب ہیں۔ اپنے معروضات

کے ثبوت کے طور پر میں یہاں صرف چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

بچپن

مٹی کے گھروندوں میں
ننھے منے ہاتھوں کے
خواب جھلملاتے ہیں

جوانی

خواہشوں کے جنگل میں
کھیل کالے جادو کا
آگ سی لگاتا ہے
جب شباب آتا ہے

ایک صحرائی منظر

زعفران اوڑھے دھوپ
لو کے کاندھوں پر بیٹھی
قہقہے لگاتی ہے

اس طرح کی نظموں میں زندگی کی منزلیں بھی ہیں، کیفیتیں بھی اور چھوٹے چھوٹے گھریلو تجربے بھی آتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ نظمیں ملاحظہ ہوں:

فون پر

فاصلوں کو ٹھگتی ہے
اس کی دل نشیں آواز
فون پر تھرکتی ہے

بچپن

ننھی داستانوں میں
بچہ الجھا رہتا ہے
خواب کی دکانوں میں

بچہ

پھول سے بھی ہلکا ہے
جسم میرے بچے کا
میرا کاندھا کہتا ہے

اس طرح کے ہلکے گہرے تجربات کے ساتھ اردو میں نظمیں بہت کم لکھی گئی ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ حنیف ترین اپنی شاعری میں ایک راہ ایسی نکال رہے ہیں جس سے ان کی انفرادیت کا تعین ہو سکے گا۔

☆☆☆

وزیر آغا

کتابِ صحرا

حنیف ترین ایک مشہور سرجن ہیں اور کافی عرصہ سے سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ مگر ان کی نظریں محض جسمانی عوارض پر مرکوز نہیں ہیں۔ وہ ذہنی اور نفسیاتی عوارض کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ فرق طریقِ علاج کا ہے۔ انسانی جسم کے معاملے میں تو وہ اعضا کو کاٹتے، جوڑتے اور رفو کرتے ہیں۔ مگر ذہنی اور نفسیاتی عوارض کے سلسلے میں وہ ترفع کے ذریعہ جذبات کے تناؤ کو ختم کر کے روح کی تسکین کا بندوبست کرتے ہیں۔ اپنے اس عمل میں وہ فقط قاری کو سکبار نہیں کرتے خود کو بھی سکبار کرتے ہیں بلکہ زیادہ تر خود ہی کو نظروں کا مرکز بناتے ہیں اور مرض کا قلع قمع بھی نہیں کرتے اسے محض اوپر سے تراش دیتے ہیں تاکہ اس کی شاخ دوبارہ پھوٹ پڑے۔ تخلیق کار کی حیثیت ایک درخت کی سی ہے۔ درخت کے زخم لگے تو اس پر ثمر فراوانی سے لگتا ہے۔ اسے ضرورت سے زیادہ صحت مند بنادیں تو وہ ایک قوی الجثہ پہلوان تو نظر آئے گا لیکن بے ثمر ہو کر رہ جائے گا۔ حنیف ترین اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں۔ لہٰذا اپنی روح کے زخم کو مندمل نہیں ہونے دیتے۔

حنیف ترین کی نظموں کے مطالعہ سے اولین تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ وہ دو صحراؤں کے درمیان کہیں رہ رہے ہیں --- ایک طرف ریت کا صحرا ہے، دوسری طرف پانی کا صحرا ہے اور یہ دونوں صحرا ان کی ذات کے اندر اتر کر ایک ایسا تیسرا صحرا بن گئے ہیں جس کے قدم پانی میں اور دھڑ ریت میں ہے۔ صحرا مسافتوں اور فاصلوں کی ایک انوکھی علامت ہے مگر یہ مسافتیں اور فاصلے اندر سے "خالی" نہیں ہوتے۔ ان میں نارسا آرزوؤں اور ادھ کھلے جذبوں کے پیکر ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ کوئی بہت گہرا دکھ جو کرب کی شکل اختیار کر گیا ہے، حنیف ترین کی نظموں میں جابجا موجود نظر آتا ہے۔ اس کرب کی کئی صورتیں ہیں۔ نمایاں ترین صورت کربِ فراق کی ہے جو کبھی کسی بچھڑے ہوئے شخص کی یاد کے روپ میں اور کبھی اپنے وطن اور گھر کے لیے نوسٹلجیا بن کر نمودار ہوتا ہے۔ آخر آخر میں وطن کی دھرتی اور بچھڑی ہوئی ہستی ایک ہو جاتے ہیں --- اس حد تک کہ ان میں تفریق کرنا ہی مشکل نظر آتا ہے۔

یہ گہرا دکھ حنیف ترین کی نظموں کی پہچان ہے۔ ممکن ہے اس کا محرک وہ دکھ ہو جو بیماروں کی حالتِ زار کو ہمہ وقت محسوس کرنے سے ان کے ہاں پیدا ہوا ہے۔ تاہم میں اسے بہر حال "محرک" ہی کہوں گا کیونکہ اس دکھ نے دراصل ان کے اندر کے دکھوں کے پنڈورا بکس کا ڈھکنا اٹھایا ہے اور پھر ہزاروں دکھ ان پر جھپٹ پڑے ہیں ---- اپنے وطن سے دور جانے کا دکھ، عزیز و اقارب سے بچھڑ جانے کا غم، اپنے اور غیروں کے لگائے ہوئے چرکے اور پھر ان سب پر مستزاد وہ آفاقی دکھ جس میں آج کا انسان بری طرح مبتلا ہے۔ ہمارے چاروں طرف جو شکست و ریخت ہو رہی ہے، قدریں ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں، طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے، قومیں اور ملک، قبیلے اور فرقے آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں ---- ان سب نے شاعر کے دل کو پاش پاش کر دیا ہے اور اس گہرے گھاؤ سے جو لہو ٹپکا ہے وہ لفظوں کے چراغ بن کر اس کے کلام میں جگمگاتا چلا گیا ہے۔

حنیف ترین کے اس مجموعے کی نظموں میں سے بعض کمزور اور بعض اچھی ہیں۔ ان کا شعری اسلوب پابند اور نثری نظم کے اسالیب کا مجموعہ ہے۔ ایک ہی نظم کے اندر پابند نظم کا آہنگ نثر کے آہنگ سے مل کر ایک انوکھی صورت میں ڈھل گیا ہے۔ ابھی ان کا یہ خاص اسلوب زیادہ پختہ نہیں ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں جذبات کا اور دماغ میں خیالات کا جو کہرام برپا ہے وہ اپنے زور میں اسلوب کی چیر پھاڑ کرنے پر بضد دکھائی دیتا ہے (تخلیقیت کے بے پناہ بہاؤ میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے) مجھے توقع ہے کہ جیسے ہی ان کے ہاں جذبات اور خیالات کا جوالا مکھی اعتدال پر آئے گا تو اس کے بہت اچھے اثرات ان کے اسلوب پر بھی مرتسم ہوں گے۔

بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ حنیف ترین کے ہاں متخیلہ بیدار اور شئے سے اس کی شعریت کشید لینے کا میلان توانا ہے۔ اعلیٰ شاعری کے لیے دونوں باتیں ناگزیر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے چاروں طرف نثر بکھری پڑی ہے۔ مگر اس نثر کے اندر شاعری کے اجزا موجود ہیں۔ شاعر وہ شخص ہے جو نثر کے بتوں میں اتر کر شاعری کے اجزا کی بازیافت کرتا ہے۔ اس معاملے میں حنیف ترین کی مہارت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لہٰذا مجھے یقین ہے کہ جس طرح انہوں نے بدن کے اندر جھانکا ہے اسی طرح وہ نثر کے اندر بھی جھانکنے میں کامیاب ہوں گے۔

میں "کتاب صحرا" کی اشاعت پر حنیف ترین صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ✡ ✡

پروفیسر نثار احمد فاروقی

لالۂ صحرا

میر تقی میر نے کہا تھا:

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

یہ شعر حنیف ترین کی شاعری پر بھی صادق آتا ہے۔ اپنے پیشے کے اعتبار سے ان کا سابقہ ''دردوغم'' سے ہی رہتا ہے مگر انھوں نے سارے جہاں کا، ساری انسانیت کا دردوغم بھی اپنے دل و جگر میں بسا رکھا ہے۔ وہ ایک بڑے خوش حال اور تاریخ ساز خاندان کے فرد ہیں۔ اپنی دنیوی اور معاشی زندگی میں خوش حال اور فارغ البال بھی ہیں، ایسی آسودہ زندگی گزارنے والا شخص اگر انسانیت کی خستہ حالی اور اعلیٰ اقدار کی پائمالی کو دیکھ کر دکھی ہوتا ہے اور اپنے دردوکرب کو اشعار کے پیکر میں پیش کرتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کے جسم میں ایک بے قرار اور سیماب صفت روح ہے، اس کی شاعری کے بین السطور میں غور کریں تو مصحفی کا شعر یاد آتا ہے

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا نہ کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

حنیف کی شاعری 'کرافٹ' نہیں، اور یہ بات سن کر کوئی نہ چونکے تو میں یہ کہوں گا کہ وہ 'آرٹ' بھی نہیں ہے۔ فطرت نے ان کی روح میں کوئی بڑا احساس راڈار نصب کر دیا ہے جس میں پورے عالم انسانیت کے آلام و مصائب منعکس ہوتے ہیں، وہ انھیں جھنجھوڑتے ہیں تو ان کے اندر چھپا ہوا شاعر بلبلا اٹھتا ہے، اس کا ردعمل نظم و غزل میں ظاہر ہوتا ہے۔ امیر خسرو کا مشہور شعر ہے:

مرا دردیست اندر دل، اگر گویم زبان سوزد
وگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

اس مرحلے میں 'سخن' سے زیادہ اہم وہ کچھ ہو جاتا ہے جو 'ماورائے سخن' ہے۔ کبھی اس کی

ترسیل بہت گہری اور پر تاثیر ہوتی ہے۔ حنیف کی شاعری میں جو کچھ نہ کہہ کر کہا گیا ہے وہ زیادہ اہم اور قابل ستائش ہے۔

ان کی صناعی اور فنکاری کا اظہار وہاں ہوتا ہے جہاں ان کی شاعری ایسے سیاسی مسائل کے دائرے میں قدم رکھنا چاہتی ہے جہاں 'اگر گویم زبان سوزد' کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے ایک آزاد، غیرت منداور غیور خاندان میں آنکھ کھولی اور حق گوئی، بیباکی ان کے خمیر میں گندھی ہوئی ہے مگر ان کی شاعری کو پرورش اور پرداخت کے لیے ایسا ماحول ملا جہاں ایسے مسائل میں دخل در معقولات کی اجازت نہیں۔ میر نے کہا تھا:

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا　　سو ٹھہرا ہے وہی اب فن ہمارا

حنیف کی شاعری بھی ان کے سخن کا پردہ بن گئی ہے، یہ فاعلاتن مفاعلن فعلن والی شاعری نہیں ہے، روح کے کرب اور دل کے زخموں کو پردے میں رکھنے والی شاعری ہے۔ ان کی فکر تخیلات کی ماورائی دنیا میں اڑان نہیں بھرتی نہ ان کے قدم زمین کو چھوڑتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں مختصر ہیں مگر وہ ایک جہان معنی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں اور طویل نظموں میں انھوں نے کہیں وہ فلمی تکنیک یعنی مونتاج (Montage) بھی استعمال کی جس میں مختلف حوادث کے پارچے جوڑ کر ایک بہت طویل کہانی کو چند مناظر میں سمیٹ لیا جاتا ہے۔

بیانِ معانی کو الفاظ کم تھے　　بلاغت کی خاطر سکڑنا پڑا ہے

اس کی مثال میں ان کی نظم ''اک خیال آتا ہے'' کو پیش کیا جاسکتا ہے اور اس سے بھی زیادہ بلیغ تازہ طویل نظم ''وہ نہیں آئی، کیوں نہیں آئی'' ہے جو ابھی حنیف کے کسی مجموعے میں شامل نہیں لیکن عالم اسلام، خصوصاً فلسطین اور عراق کی ہم عصر سیاسی تاریخ کو چند لفظوں اور اشاروں میں قید کر لیتی ہے۔

ان کی نظر صارفین کلچر کی بے آب ورنگ مصنوعی زندگی کو ''روبوٹی تہذیب'' سمجھتی ہے جس میں بظاہر تو بڑا طمطراق نظر آتا ہے مگر اس کی اصلیت کچھ نہیں اس لیے کہ یہ صدیوں کی آزمودہ اخلاقی اقدار سے اپنا رشتہ استوار نہیں رکھتی۔ اس کی مثال میں ان کی یہ مختصر نظم پیش کی جاسکتی ہے یہاں الفاظ اپنی حقیقی معنویت کھو بیٹھے ہیں اور ہم خود کو اپنا غیر سمجھنے لگتے ہیں:

نیلم سے لفظوں کے ریوڑ
فکر کی زرّیں کان سے اٹھ کر

قسمت کاغذ کی لکھتے ہیں
مٹی کو سونا کر کر کے
شعر و ادب کا دھن بنتے ہیں
مگر ثقافت کی منڈی میں
تلتے ہیں پتھر کے بھاؤ
روبوٹی تہذیب چمکتی دوری ہے

دورِ حاضر کی تہذیب نے معاشی ناہمواری اور استحصال کے باعث دنیا کے بڑے حصے کو ایک ایسے پراسرار خوف میں جکڑ رکھا ہے جس نے حیات و کائنات کے بارے میں کئی نسلوں کے آزمودہ تصورات کو کھوکھلا کر دیا ہے اور ان پر ہمارے ایمان و ایقان کو متزلزل کر دیا ہے۔ اس چھوٹی سی نظم میں جو رمزیت اور معانی کی ترسیل ہے وہ ہمیں شاعر کے احساس کی پنہائیوں کا اندازہ کرنے میں مدد دیتی ہے:

خوف کی دیمک
بیدردی سے
اُجلی نیند کو
چاٹ رہی ہے
دھوپ میں ظلمت بانٹ رہی ہے

وہ دیکھتا ہے کہ حالات نے زندگی کے حقیقی چہرے کو چھپالیا ہے اور ہم ایسی فضا میں جی رہے ہیں جیسے کوئی بہروپیا روپ بھرے اور پھر اسی بہروپ کو اپنا اصلی روپ سمجھ بیٹھے:

کیسے کھلے یہ ماجرا، چہروں کی اصلیت ہے کیا
شہر ہوس کی بھیڑ میں جو ہے نقاب پوش ہے

میں نے ان قبائل میں ایسے لوگ دیکھے ہیں
سچ پہ کٹ رہے ہیں جو
شیخ سارے شیخوں کا دوست ہے محمد کا
جو ابو محمد نے اپنے دل میں بویا تھا

جس نے اپنے خطبے میں جارج بش کو ڈانٹا تھا
لیبیا کی سینکشن پر، یواین او رزولیوشن پر
مدتوں جدیدہ میں جس کا نور پھیلا تھا......

پھر خیال آتا ہے
اپنے ملک میں بھی تو
آج کی سیاست میں
مجرموں کا غلبہ ہے..........

۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کا حادثہ بھی اس نظم میں خاموشی سے سرایت کر جاتا ہے اور وہ اس طرح ظاہر ہوتا ہے

مر گیا ہے انساں پھر
دل مرا عبادت گاہ
اس کو ڈھا کے کہتے ہو
کچھ سکوں ملا تم کو
بد نصیب قوموں کے
ہوں جو راہبر اندھے پھر دھماکے ہوتے ہیں
ڈر کے مارے سب انساں خوف پی کے جیتے ہیں

مگر کتنا ہی بڑا حادثہ ہو، ایک عزم و ہمت والا انسان اسے للکارتا ہے اور کہتا ہے:

وہ عظیم ہوتے ہیں، تخت ان کے ہوتے ہیں
ضعف اک بُری شے ہے
ہو سکے تو قوت بن
جب تلک یہ دنیا ہے ان کو زندہ رہنا ہے
جن کے ذہن و بازو میں بے پناہ قوت ہے

ہر شاعر کو اس کی پوری زندگی اور معاشرے سے جوڑ کر دیکھنا چاہیے مگر عموماً ہم صرف شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ پورے شاعر کو بھی نہیں دیکھتے اس کی فنکاری کے نمونوں کو پرکھتے رہ جاتے ہیں حالانکہ وہ پرکھ بھی بھرپور نہیں ہوتی اور شاید ہو بھی نہیں سکتی۔ حنیف ترین بساطِ شعر و سخن پر تازہ وارد نہیں ہیں، پچیس برسوں سے اپنی ہی تلاش کر رہے ہیں۔ ان کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے

ہیں۔ برصغیر کے معتبر ادبی رسالوں میں شائع بھی ہوتے رہے ہیں، بعض نظموں کے ترجمے دیسی اور پردیسی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ انھیں اگر ایک بڑے فریم ورک میں دیکھا جائے تو ان کا وطن مالوف سنبھل ہے جو ہندستان کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ آج وہ کہنے کو قصبہ ہے مگر عہد مغلیہ میں صوبہ کے صدر مقام کی حیثیت رکھتا تھا، دستاویزوں میں اسے ''سرکارِ سنبھل'' لکھا جاتا تھا۔ یہاں ہند۔ مسلم ثقافت اور علوم شرقیہ کی مستحکم روایت بھی رہی ہے ان کے آباء واجداد وہ تھے جن پر ابوالطیب المتنبی کا یہ شعر صادق آتا ہے:

الخیل و اللیل و البیداء تعرفنی
والسیف والرمح و القرطاس و القلم

سنبھل میں باون بڑے محلے ہیں جو سرائے کہلاتے ہیں ان میں سرائے ترین ان کے اجداد کا بسایا ہوا ہے۔ سنبھل کے لوگ سادہ و بے ریا زندگی گزارنے والے، جفاکش، انسان دوست اور معارف پرور ہوتے ہیں۔ مشرقی تہذیب آج بھی اس شہر میں بڑی حد تک زندہ ہے۔ اس ماحول میں حنیف نے آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے خاندان میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔

اس دانش کدہ سے انھیں گہرا قلبی تعلق ہے اور ان کے برادر عزیز ندیم ترین نے تو اس مادر درسگاہ کی ایسی خدمت کی ہے جس کی دوسری مثال اب تک نہیں ہے۔ انھوں نے اس یونیورسٹی میں ایک پورا بڑا ہاسٹل تعمیر کر کے قوم کے نام وقف کیا ہے۔ خود حنیف ترین بھی تعلیمی اداروں کی دل کھول کر مدد کرتے ہیں اور اپنی زندگی بھر کی کمائی سے خواتین کی تعلیم اور فنی تربیت کے ادارے قائم کرنے کے علاوہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حیثیت کو بہت مضبوط بنایا جائے۔ اس کے لیے بہت سے منصوبے ان کے ذہن میں پرورش پا رہے ہیں۔

حنیف نے میڈیکل سائنس پڑھنے کا ارادہ کیا تو کشمیر جنت نظیر میں پہنچ گئے، وہاں سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد انھیں سعودی عرب کے سرکاری اسپتال میں خدمت کا موقع مل گیا اور وہ آج کل شمال میں عرعر کے مدیر مستشفی ہیں۔ ان کی فنی حذاقت نے وہاں کے عوام اور خواص دونوں میں ان کو مقبول بنایا ہے تو انھوں نے بھی اس صحرا میں ایسے پھول کھلائے ہیں کہ آئے دن ادبی محفلیں، مشاعرے اور ثقافتی اجتماع ہوتے رہتے ہیں جن میں مختلف ممالک کے لوگوں کو بھی ایک دوسرے کے قریب آنے اور سمجھنے سمجھانے کا موقع ملتا ہے۔ کشمیر نے ان کے دامن دل کو ایسا کھینچا

کہ انھوں نے ایک کشمیری خاتون سے ہی شادی کی اور اب ماشاءاللہ خوشیوں سے بھرپور ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی زندگی کا یہ بلیو پرنٹ دیکھیے کہ اس میں ایک ایسا فارمولا ابھر کر سامنے آتا ہے جسے ہم یوں لکھ سکتے ہیں:

ترین افغان+ سنبھل+ اردو+علی گڑھ+صحرائے عرب = شاعری۔ مرکب یونانی ادویہ میں بہت سے اجزاء ہوتے ہیں ہر جزو کی اپنی تاثیر ہوتی ہے، مگر ایک جزوِ اعظم ہوتا ہے اس کا جو اثر مقصود ہے اس کو ابھارنے کا دوسری ادویہ کام کرتی ہیں۔ ترین افغان نسبت نے انھیں ایک مستحکم کردار دیا ہے جو حق و باطل میں تمیز کرتا ہے اور حق کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ سنبھل کی معاشرت کے اثر نے انھیں اپنی ثقافت، تہذیب اور مذہب سے جوڑا ہے، اردو ان کی مادری زبان کا لب اظہار ہے جو علی گڑھ کی سان پر چڑھ کر اور بھی دھاردار ہوگئی ہے۔ کشمیر نے انھیں حسن فطرت سے قریب کیا ہے، ان کے احساس جمال میں تازگی اور حرکت پیدا کی ہے تو صحرائے عرب میں رہ کر انھوں نے ناموافق حالات سے مفاہمت کرنا سیکھا ہے۔ ان سب ظاہری نسبتوں کا مجموعی اثر یہ ہے کہ ان کی فکر روشن، نظر دوررس اور شعور بیدار ہوگیا ہے۔ ان سب خصوصیات کا انعکاس ان کی شاعری میں ہوتا ہے جس میں غیر معمولی حساسیت، اور بچوں کی سی معصومیت ہے مگر جزوِ اعظم ان کا احساس جمال اور دردمندی ہے۔ انھوں نے نظم اور غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل اپنی روایت سے پیوستہ ہونے کے ساتھ ہی کہیں تجدد کی حدوں میں تجاوز کرتی ہوئی ملتی ہے تو نظم میں ہیئت کے کچھ تجربے اسے نیا انداز دیتے ہیں۔ حنیف کی شعری لفظیات میں کہیں معنوی انحراف ہوا ہے اور ایسا ہم اخترالایمان کی لفظیات میں بھی دیکھتے ہیں مگر یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب الفاظ معانی کے جوش اور شدت کا ساتھ نہیں دے پاتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں:

میرے لفظوں میں روانی اور ہے
دردِ دل کی یہ کہانی اور ہے

دردِ دل کی کہانی لفظوں کے مزاج اور ان کی روانی پر بھی لازماً اثر انداز ہوتی ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ عہد جدید کی شاعری کے منظر میں حنیف ترین کی شاعری لالۂ صحرا کی طرح جگمگا رہی ہے۔ اس کے حسن اور تاثیر کو ہم ٹکے بندھے معیاروں سے جانچ کر پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔

✪ ✪ ✪

غزلیہ سیاق و سباق

راج بہادر گوڑ

پیاس کے پھیلاؤ میں حنیف ترین کا 'ربابِ صحرا'

میرا نظریہ یہ ہے کہ ہر تخلیق کا اپنا زمانہ ہوتا ہے اور تخلیق معاشی اور سماجی محرکات کے تابع اور زیر اثر ہی وجود میں آتی ہے۔ میں اس منطق کو بہت احمقانہ مانتا ہوں کہ آج کوئی غالب یا میر پیدا نہیں ہوتا۔ آج کے حالات میں غالب اور میر پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔ اس زمانے کے جو مجموعی معاشی حالات تھے انھوں نے غالب اور میر پیدا کیے۔ اس زمانے کے جو حالات ہیں ان میں تو حنیف ترین پیدا ہوں گے۔ ہمارے عہد کے شاعروں کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہمارے عہد کے غزل گو شعرا نے روایت سے بغاوت کر کے غزل کے مواد کو بدل دیا ہے۔ ہمارے شعرا نے اپنے پیش رو شعرا کو اپنے سامنے رکھا تو ضرور مگر صرف اس حد تک کہ ان کے اشعار میں سے عصری مواد نکالا جا سکے۔

حنیف ترین کی شاعری مجھے اقبال کے اس مصرع کے مصداق معلوم ہوتی ہے۔

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

مگر حنیف ترین کے خواب کی نوعیت اقبال کے خواب سے مختلف ہے یوں ان کی شاعری کا Ralevance بھی مختلف ہوگا اور اسے مختلف ہونا بھی چاہیے۔ حنیف کے نزدیک خوابوں کی آبیاری صرف خون سے ہو سکتی ہے اور جب تک خوابوں کی آبیاری کے لیے خون کا استعمال نہیں کیا جائے گا، انسان سوتا رہے گا اور اسے صرف پیش رو شعرا (مثلاً اقبال) کی شاعری کے ذریعے بیدار نہیں کیا جا سکتا:

وہیں کھلے رہے بیداریوں کے پھول سدا
جہاں بھی خون سے خوابوں کی آبیاری ہوئی

حنیف کی شاعرانہ پرواز اس ہوا کی مانند ہے جسے قید نہیں کیا جاسکتا اور اگر ایسا کیا جائے گا تو پھر پوری کائنات میں حبس کا عالم بپا ہو جائے گا۔ حنیف کی شاعری نئی شاعری ہے، بالکل نئی۔ اس لیے ان کی زبان مسلّمہ تلازمات اور زبان کے چٹخارے سے آزاد ہے۔ اس شاعری میں زبان کا وہ استعمال اور انداز تلاش ہی نہیں کرنا چاہیے جو اساتذہ فن سے منسوب ہے۔ حنیف کی زبان ابھی تخلیق ہونے کے مراحل سے گذر رہی ہے۔

حنیف ترین اس وقت شاعری کے جس مرحلے میں ہیں وہ ایک طرح سے بچپن کے رخصت ہونے اور نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے زمانے کی طرح ہے۔

حنیف کے کلام کے اس مجموعے کے پہلے ہی شعر کو دیکھیے ۔

مصیبتوں کو میرے گھر کا جب پتا دینا
میرے خدا مجھے لڑنے کا حوصلہ دینا

شاعر خدا کو مصیبتیں دینے سے منع نہیں کرتا لیکن چاہتا ہے کہ اسے لڑنے کے حوصلے سے بھی نوازے۔ مصیبتوں سے جدوجہد شاعر کا جذباتی مرکز ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر ۔

قضا کے خوف سے احساس سرد ہیں جن کے
انھیں کڑی سے کڑی دھوپ کی سزا دینا

موجود سے ناآسودگی کے خلاف جدوجہد کے عواقب سے اگر کوئی خوف زدہ ہو جاتا ہے، اس کے احساسات سرد ہو جاتے ہیں تو پھر شاعر خدا سے دعا گو ہے کہ اسے کڑی دھوپ کی سزا دینا۔

اب یہ شعر سنیے اور سوچتے رہیے۔

ملے گا آئینے میں کیا تلاشِ نامراد کو
کہ ٹوٹے عکس کی بکھرتی کرچیاں ہیں دور تک

اس شعر میں حنیف آج کے دور میں انسان کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام کی کارستانیوں نے اس کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے وہ بکھر گیا ہے، وہ اپنے ماحول میں اجنبی ہے۔ اب آئینہ دیکھے بھی تو اسے یہی بکھری ہوئی کرچیاں ملیں گی۔

اور یہ شعر ۔

فصلوں کو ہر خطر سے میں کرتا ہوں ہوشیار

کھیتوں کے درمیان وہ اونچی مچان ہوں

شاعر کسان کے کھیتوں میں ایک اونچی مچان کی طرح کھڑا ہے اور اس کی خاموشی بھی کھیتوں کی رکھوالی کرتی ہے۔ اسی مچان پر سے کھیتوں کے 'دشمن' کو دور سے آتے ہوئے بھی دیکھا جاسکتا ہے، اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی ایک انسان کی کھوپڑی جیسی ہنڈیا بانس سے لگادی جائے تو تباہی مچانے والے پرندڈر جاتے ہیں۔ یہاں شعر کا منصب کس شاعرانہ خوبی سے بیان کیا گیا ہے، قاری محسوس کر سکتے ہیں۔ پھر یہ شعر۔

اوڑھ کر نکلی جو جدت کا نیا سایہ غزل
فکرِ کہنہ کی ہوئیں ساری قبائیں بنجر

بغاوت اور روایت کا تسلسل جاری ہے۔ روایت جب نئے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی راہ حائل میں ہو جاتی ہے تو پھر بغاوت ضروری ہو جاتی ہے۔ ادب میں بھی یہی ہوا ہے۔ آج انسان اس منزل میں ہے جہاں شعر حالات کو بھول کر اپنے اندر محصور ہو جانے کا ذریعہ بنا رہے تو تشفی نہیں ہو سکتی۔ شعر کو جدوجہد کا حوصلہ بڑھانے والا بھی ہونا چاہیے اور ایسے میں غزل جب اس نئے مواد سے لیس ہو کر میدان میں آتی ہے تو فکرِ کہنہ کی ساری قباؤں کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔

اب کچھ حسب حال شعر سنیے۔

پہنچی اب اس مقام پر جنگی عداوتیں
سالم ہیں بستیاں مگر اک بھی نہیں مکین

شہروں کی اندھی بہری سیاست کی راکھ میں
جلتے ہوئے مکان کے گونگے الاؤ تھے

آدمی میزائلوں میں گم رہا
آدمیت قتل تک ہوتی رہی۔

جس کو تیزاب کی بھٹی میں جلا ڈالے ہو
امن کے گیت اسی لاش پہ گاتے کیوں ہو

آگ پر تیل ڈال کر تم کیوں
امن اور آشتی کی بات کرو

اور یہ شعر۔

جو حق پہ رہے ان کو ملے سنگ ہمیشہ
ظلمت سے اجالوں کی رہی جنگ ہمیشہ

ان کو تباہ کرگئی احساس کی شکست
اندر جو اپنے گھل کے بھی لب کھولتے نہ تھے

خونِ ناحق پہ مرے سب رہے خاموش مگر
رو پڑا کون؟ یہ آواز کہاں سے آئی

شاید یہی انسانیت کا ضمیر ہے جو زندہ ہے

اپنی تہذیب و تمدن کی بقا کی خاطر
آؤ آواز تو دیں قوم کے معماروں کو

کہیں یہی معمار، تہذیب کی تخریب کے در پے تو نہیں؟ قاری سوچے۔
اور یہ شعر۔

دیوتا نے سجا کے مندر کو
خون کی بھینٹ لی خدائی سے

پارساؤں کی حقیقت دیکھیے۔

خون پیتے رہے، شراب نہ پی
پارساؤں نے پارسائی کی

غرض یہ مختصر تعارف ہے حنیف کے تازہ کلام کا۔ یہ ''رباب صحرا'' ہے۔ حنیف سعودیہ میں شعبۂ صحت سے وابستہ ہیں۔ ریگستان کے منظر ان کے سامنے ہیں اور ساحل سمندر کی خنکی ان کے پیچھے ہے۔

تھوں میں ریت کی عجیب سسکیاں ہیں دور تک
سوار دھول پر ہوا کی ہچکیاں ہیں دور تک
بجھی ہے پیاس دور تک سمندروں پہ ریت کی
کہ آسماں میں بادلوں کی کشتیاں ہیں دور تک

یہاں پیاس کا پھیلاؤ، ہوا کی ہچکیاں، ریت کی سسکیاں ان حالات کی طرف اشارہ کرتی ہیں جن سے آج ریگستان کے ان مکینوں کو سامنا ہے۔اور پھر یہ شعر۔

مباحثے میں اسی کو کیا گیا تسلیم
وہ بھید جس کا حوالہ منافقانہ تھا

کہیں ان مباحث کی طرف اشارہ تو نہیں جو اقوام متحدہ کے ایوانوں میں عربوں کے تعلق سے ہوتے ہیں؟

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

رباب صحرا کا مسافر

اردو ادب پر نقد و نظر کے مختلف طریقے ہیں۔ ہر ناقد اپنے مقررہ اصولوں پر شاعر یا ادیب کو پرکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اپنے مقررہ سانچوں میں اس کو محصور کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس انداز نقد کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ تنقید کے وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ شاعر کو اس کے عہد میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ اس روایت کے ساتھ اشعار میں ان کے عہد کی آواز بھی سنائی دے۔ آیئے دیکھیں کہ حنیف ترین اس منزل سے کس طرح عہدہ بر آ ہوئے ہیں۔

حنیف ترین کا مجموعۂ کلام "رباب صحرا" نظر سے گزرا۔ محسوس ہوا کہ شاعر اپنی زبان میں کوئی پیغام دینا چاہتا ہے۔ اپنے کرب کو دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے رحم کی اپیل کرنا چاہتا ہے۔

یہ کرب اس کا اپنا ذاتی بھی ہے اور اپنے ماحول کا بھی۔ مگر صحت مند روایت یہ ہے کہ وہ ہمت نہیں ہارتا۔ ان کے پاس اس درد کا مداوا تو نہیں ہے مگر مداوا کی تلاش میں اپنے گرد و پیش پر ایک مبصر کی طرح نظر ڈالتا ہے۔

غزل کو جب رشید احمد صدیقی نے اردو شاعری کی آبرو کہا تھا تو یہ صرف ان کا انداز بیان نہیں تھا بلکہ وہ جانتے تھے کہ جملہ اصناف سخن کے مقابلہ میں غزل میں حالات کا مقابلہ کر کے زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے شائع ہونے کے بعد ایوان شاعری میں جو زلزلہ آیا اس کا ہدف سب سے پہلے غزل بنی۔ ترقی پسند تحریک نے غزل کو معتوب قرار دے دیا۔ مگر غزل کا استحکام ہر زمانہ میں قائم رہا۔ یہ عزم اس کی قوت بھی تھا اور چیلنج بھی۔ غزل میں یہ قوت ہے کہ وہ کائنات کے سربستہ رازوں کو اور انسانی اسرار کو کنایہ اور ایجاز کے ساتھ بیان کرے اور مستقبل کے اسرار کو منکشف بھی کرے۔ مگر یہ خیال رہے کہ شاعری حقائق کے اظہار کا نام ہے مگر ہر حقیقت کا اظہار شاعری نہیں ہے۔ یہ قول

جس طرح دوسری اصناف سخن پر صادق آتا ہے، اسی طرح غزل پر بھی اس کا نفاذ ہوتا ہے۔ حقائق کا اظہار حنیف ترین کے یہاں کس طرح ہوا ہے اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ فلسطین کی جنگ آزادی کے لیے اسرائیلی بندوقوں کا مقابلہ بچوں نے کس طرح کیا تھا۔ یہ ایک زندہ قوم کی تاریخ کے نہ مٹنے والے نقوش ہیں۔ حنیف ان جیالے بچوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

گولی کے سامنے ہیں جو پتھر لیے حنیف
میں ان جیالے بچوں کی جرأت کا مان ہوں

جو حق کے لیے جان ہتھیلی پہ لیے ہوں
ہم ایسے جری قوم میں کم یاب نہیں ہیں

خون ہو خون تو جینے کا مزا دیتا ہے
اور بہہ کر نئی تاریخ بنادیتا ہے

کیا ان اشعار میں تاریخ کے لیے کوئی سبق نہیں ہے؟ حنیف کو سیاست اور سماج کی کمزوریوں اور گندگی کا اندازہ ہے۔ لہٰذا بار بار متنبہ کرتے ہیں۔

نئی سیاست کی گندگی میں جو ہوگا شامل
وہ شخص ایک دن خود اپنی نظروں میں خوار ہوگا

لو دے اٹھے نہ پھر کہیں خود غرضیوں کی راکھ
اِن سر پھری ہواؤں کو مت آزمایئے

میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ حنیف کے یہاں کرب تنہائی کے باوجود جس سفر میں "نہ ان کی منزل ہے اور نہ کوئی رفیق" وہ حوصلہ نہیں ہارتے ہیں۔ یہ رجائیت پسندی ادب اور زندگی دونوں کی صحت مند علامت ہے۔ ان کو یقین ہے کہ روشنی نے کبھی ظلم سے شکست نہیں پائی ہے۔ چند لمحات کی گھنگھور گھٹا روشنی کی کرن کو نہیں مٹاسکتی۔ یہ یقین ایک مومن کا یقین ہے۔ جب وہ ضلالت کا اندھیرا دیکھتے ہیں تو شمع رسالت سے روشنی کے طلب گار ہوتے ہیں:

ضلالت کے اندھیروں کا نشاں تک مٹنا ہو تو
چلو چل کر اجالا مانگ لیں شمع رسالت کا

حنیف کے مزاج کو سمجھنے کے لیے چند اشعار اور سن لیجئے:

اپنی تہذیب و تمدن کی بقا کی خاطر
آؤ آواز تو دیں قوم کے معماروں کو

وقت و حالات کے بکھرے ہوئے گل دانوں میں
گل فردا کو سلیقے سے سجا کر رکھئے

ہے دلیری بھی زندگی کی دلیل
بزدلی موت کی نشانی ہے

آیئے اب ذرا عشق و محبت کی باتیں بھی ہو جائیں۔ دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی سرحدیں ٹوٹ چکی ہیں۔ محبت کے تصور نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا ہے۔ مگر اس نئے روپ میں حنیف ترین نے اپنا رشتہ ماضی کی روایات سے نہیں توڑا ہے۔ حامدی کاشمیری نے بجا طور پر لکھا ہے:

"عشقیہ اور انسانی رشتوں کی پاسداری ہو یا ان سے شکست سے پیدا ہونے والی دل شکستگی۔ وہ روایت سے انحراف نہیں کرتے وہ روایت کا شعور رکھتے ہیں۔"

حنیف عشق و محبت کے معاملات میں ہجر و وصال۔ واعظ اور ناصح یا رقیب کے چکر میں نہیں پڑتے۔ ان کے یہاں جذبات عشق کا سادہ معاملہ ہے جس کو وہ سادہ انداز میں کہہ جاتے ہیں۔

سن کر وفا کی داستاں
لو وہ بھی اب مغموم ہے

چودھویں شب کے حسین سرمئی ماتھے پہ حنیف
وہ بھی میری ہی طرح چاند کو تکتا ہوگا

بات نکلی جو بے وفائی کی
دل پہ اک یاد نے چڑھائی کی

ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

آنکھ قاتل تمہاری جان مقتل ہماری
دل ہی کیا جان لے لو تم کو جو شے ہو پیاری
ہے جنوں خیز موسم باتیں سمجھو ہماری
سبز دوپٹے لہرا کر ساون برسا دھانوں پر

مجھے احساس ہے کہ اشعار کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ مگر دعوا بغیر دلیل ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے اشعار کا سہارا لینا پڑا۔
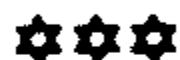
مصور سبزواری

حنیف ترین ـــــ ایک حرکی شاعر

اِدھر کئی سال سے ڈاکٹر حنیف ترین کی غزلیں جو ادبی رسائل میں شائع ہورہی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حنیف آوازوں کے بیکراں صحرا میں اپنی آواز اور لب و لہجے کو کھوجنے میں مصروف ہے لیکن اس عمل کی تکمیل کے لیے ایک طویل جدوجہد درکار ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ حنیف اپنی اس لگن کو جنونی حد تک قائم رکھے ہوئے ہے۔

حنیف بیداری اور خرد کا متوالا ہے۔ اس کے یہاں نہ رومان پسندی ہے نہ بے جان تعقل۔ وہ شاعری کو کہیں بھی جامد دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ صرف حرکی رویے کا قائل ہے۔ وہ بوڑھی قوموں کی طرح ماضی کی طرف معکوس سفر کرنے سے گریز کرتا ہے، وہ اپنی سوچوں کو حرکت میں لانے کا متمنی ہے اس لیے اس کے کلام میں لذت نہیں۔ سوز و گداز کی دریوزہ گری سے جو اُداسی کی فصلیں ہمارے جدید شعراء اُگاتے ہیں اور احساسِ دردمندی کی فرضی گلی کوچوں میں جلائے پھرتے ہیں۔ حنیف اس ڈرامائی اقدام سے بیزار ہے یا اس میں اس قسم کا ناٹک کرنے کا حوصلہ ہی نہیں۔ وہ سچا اور ازلی انسان لگتا ہے۔ وہ دل کے امراض کا مسیحا ہے، ماہر ہے۔ مگر نہ جانے ان گنت ٹوٹے دلوں کی رفوگری میں یہ شاعری اس کے اندر کہاں سے در آئی؟ وہ ملاقات کے دوران نہ شاعر لگتا ہے نہ شاعری کی روایتی گفتگو کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے شاعر جو ساری عمر شاعری اوڑھتے اور پہنتے ہیں عمیق تجزیہ کرنے پر حقیقی شاعر ان کے اندر سے بھی برآمد نہیں ہوتا پھر حنیف سے کیا شکوہ، وہ تو اس کا مدعی ہی نہیں۔ لیکن مسئلہ تو یہی ہے کہ تمام تر شاعرانہ مفروضوں سے آزاد ہو کر بھی حنیف کے پاؤں میں شاعری کی ایک ایسی زنجیر پڑی ہوئی ہے جس کی مدھم مدھم جھنکار سے انکار نا ممکن ہے اور وہ جھنکار مسلسل تیز ہوتی جارہی ہے۔

یہ تو طے شدہ ہے کہ حنیف کے نزدیک شاعری کا عمل محض اصوات یا الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ فنکار اور قاری کے افکار میں ہیجان پیدا کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔ ن۔م راشد کے اِن الفاظ کو

وہ بڑی قدر سے دیکھتا ہے کہ اک جنوں لپکے۔ آدمی چھلک اٹھے۔

اس کے لیے بھی زندگی کی حرکت اور رفتار قید میں نہیں آگ اور خون کے رقص میں ہے۔ آگ کا خفیہ خلیہ، احساس اور لہو رنگ شعلوں کا ذکر اس کا محبوب موضوع ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے بھی ہوا کہ تقریباً ایک دہائی سے وہ خلیجی ممالک کی بے پناہ دولت کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے اترتے چڑھتے سیاسی اور سماجی بحران کا یہ بھی تماشائی ہے۔ اپنے وطن سنبھل سے کالے کوسوں پر وہ سعودی عرب کے ایک ایسے مقام پر بیٹھا ہے جہاں اک بہت بڑے حادثے کے تین اجزاء فلسطین، صیہونیت اور ہجرت اس کی چشم تماشا کو نمناک بنائے ہوئے ہیں۔ وہ چیخیں جو آج عراق، شام، مصر، لبنان اور فلسطین کی فضاؤں میں طوفان کی صورت ابھر رہی ہیں وہ کروڑوں دل سے گزرتی ہوئی حنیف کے دل تک بھی اتر گئی ہیں جس کے نتیجے میں حنیف کے شاعرانہ جذبات اپنی نزاکتوں، لطافتوں، رنگوں اور سایوں کے ساتھ عکس ریز ہونے کے بجائے تاریخی صداقت کی طرح کھر درے اور ٹھوس ہو گئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حنیف نے اپنے شعری رویے میں آتش نوائی سے ہم آہنگ ہونے کی کوئی ناکام کوشش کی ہے۔ بلکہ اس کا المیہ یہ ہے کہ اس کے اردگرد پھیلے ہوئے مناظر نے جو تناظر اس کے لیے فراہم کیا ہے وہ تشدد جبریت اور بے رحم منافقت کا ہی ہے۔ فطری طور پر حنیف احترام آدمیت کا شیدائی ہے۔ وہ زندگی اور ادب دونوں میں ہی ایک مفعول اور بے عمل رویے پر مشتعل ہو جاتا ہے۔ وہ شاعری سے حصول مسرت کے بجائے ایک ایسی زندہ تڑپتی چیختی آواز سننا چاہتا ہے جو فرد کو الگ تھلگ جزیرہ نہ بنا کر اجتماعی عمل اور قومی تشخص کی نشاندہی کر سکے۔ حنیف کے سامنے زوال آمادہ تہذیبیں ہی نہیں زوال پذیر وہ قومیں بھی ہیں جو اپنی شناخت سے محروم ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے یہاں شعر کا منصب یہی ہے کہ تاریخی زوال میں جب قومیں اپنی پہچان کھو دیں تو شعر اور شاعر دونوں شمع شناخت روشن کریں۔ اجتماعی حوالے سے اگر ممکن نہ ہو اپنے شخصی حوالے سے ہی سہی۔

چاندنی، پھول، خوشبو، خواب، شاعری کے پسندیدہ وسائل ہونے کے باوجود بیحد عامیانہ وسائل بھی ہیں۔ چونکہ حنیف ذاتی طور پر اپنی بات کہنے کا خواہش مند ہے اور غیر رومانی حقیقی انداز میں، اس لیے اس کے مزاج میں تنویر سپرا کی طرح شب و روز پیش آنے والے زندگی کے تلخ حقائق اس طرح داخل ہو گئے ہیں کہ انھوں نے اسے غنائی اور رومانوی حسن

سے الگ ہی رکھا۔ اس کے اشعار نہ حسین ہیں نہ علامتی اور نہ استعاراتی تنظیم سے آراستہ مگر ان کے بطن میں جو سچائی ہے وہ ابدی ہے اور خوبصورت ہے۔ جگہ جگہ حنیف نے معاشی ابتری اور غیر منصفانہ طبقاتی تقسیم سے پیدا ہونے والے عالمگیری کرب کو غزل کی شاعری بنا دیا ہے۔ اس لیے اس کے بیشتر اشعار میں نوکیلا پن اور کھردرا پن ہے۔ اور یہی کھردرا پن اس کی انفرادیت بھی ہے۔ یہ کھردرا پن اپنا ایک باطنی حسن رکھتا ہے، جس میں شاعر نے اپنے اظہار کی قوت اور سچائی سے اکثر مقامات پر غیر معمولی جاذبیت اور عصری صداقت سموئی ہے۔ ایک اہم بات یہ کہ حنیف کی شاعری آسمان زاد نہیں زمیں زاد ہے اور اصلی ہے۔ محض جمالیاتی حسن ڈھونڈنے والے کم مایہ قاری یا سامع کو اپنے تنگ ذہنی افق کے باعث حنیف کے یہاں کوئی خوبی نظر نہیں آئے گی کیونکہ یہ طے شدہ نتائج کی شاعری ہرگز نہیں، یہ ان بھاگتے دوڑتے موجودہ لمحوں کی کرب انگیز شاعری ہے جو انسانی سوچ اور زاویوں پر دن بہ دن اپنی گرفت توانا کرتے جا رہے ہیں۔

حنیف کسی گہری معنویت کا نہیں گہرے تجربے کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری کی سمت راسخ ہے۔ اس کی شاعری کا واضح عنصر تلخیوں کی شاعری ہے اور کس میں ہمت ہے کہ آج کے عہد میں زندگی کی ان بے پناہ تلخیوں اور ناگزیر صداقتوں سے انکار کر دے۔ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ رواں دواں زندگی کی تلخیوں کو کمالِ فن بنانے میں حنیف اپنی پیاس کے کتنے بے آب صحراؤں سے گزرے گا؟ چونکہ وہ اظہار کے مختلف اسالیب مختلف شعری فضا اور مختلف فارم کی تلاش میں سرگرداں ہے، اس لیے اس سے یہ توقع بیجا نہیں کہ اپنے مسلسل شعری سفر کے دوران وہ جلد شاعری کے نئے نئے امکانات اور آفاق اپنے ذہین اور باشعور قاریوں پر منکشف کرے گا۔ جدید شعراء کی بھیڑ میں وہ ابھی سے منفرد دکھائی دینے لگا ہے۔ اس کے چند اشعار ہی اس کی منفرد اور وقیع شعری صلاحیت کے ضامن ہیں اور اس کے اگلے سفر کے رفیق بھی۔

تھوں میں ریت کی عجیب سسکیاں ہیں دور تک
سوار دھول پر ہوا کی ہچکیاں ہیں دور تک

تہہ بہشت لے گئیں وہ گندمی لطافتیں
زمیں کے سبز ذائقوں میں زردیاں ہیں دور تک

ملے گا آئینہ میں کیا تلاش نامراد کو!
کہ ٹوٹے عکس کی بکھرتی کرچیاں ہیں دور تک

ہوا کی تیز دھار سے جو رنگ قتل ہوگئے!
سنورتے موسموں میں ان کی دھجیاں ہیں دور تک

دیے کی روشنی سورج کے کام آئے گی
ہوا کے قتل کا جس روز فیصلہ ہوگا

بوسیدہ اچکنوں میں چھپی آن بان ہوں
میں بھی کسی عروج کا مٹتا نشان ہوں

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی

حنیف ترین - ایک مہجری شاعر

حنیف ترین ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے وطن سے دور نئے ماحول اور اجنبی فضاؤں میں گزارا ہے۔ اردو زبان کے حق میں جہاں یہ ایک فال نیک ہے کہ اس کی سرحدیں وسیع ہو رہی ہیں اور اس کی نئی بستیاں وجود میں آ رہی ہیں، خود فنکاروں اور اردو سے وابستہ ادیبوں کے لیے یہ ایک صورت حال ایسے چیلنج کی ہے جس کو قبول کیا جانا بیشتر صورتوں میں ان کی مجبوری ہی کہی جا سکتی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ، امریکہ اور افریقہ کے ممالک میں رہ کر کسی بھی اردو ادیب و شاعر کے لیے زیادہ آزمائش کا زمانہ ہوتا ہے جب کہ دنیائے عرب کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ ممالک ہیں جن سے ہماری مذہبی، مسلکی اور عقائد کی حد تک کسی نوع کی عدم یگانگت نہیں ہے اور اس لحاظ سے مانوس صورت حال کے سبب تخلیق کار کو اجنبیت اور بیگانگی کے احساس سے کم سابقہ پڑتا ہے، لیکن حقیقت حال اس سے کافی حد تک مختلف ہے۔ سچ یہ ہے کہ عقائد کی حد تک ہم مشربی کے باوجود دنیائے عرب میں لسانی و ثقافتی بعد کی دیواریں اس قدر بلند ہیں کہ انہیں عبور کیا جانا تقریباً ناممکن ہے تعصباتِ ذہنی جو استعماری نظام کے زائدہ میں وہ مزید فکری ہم آہنگی اور موانست کے لیے سد راہ بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس غیر جمہوری آدم بیزار ماحول میں شجر زندگی کے بار آور ہونے کا امکان کب ہو سکتا ہے، تاہم روزی روٹی اور روزگار کے جبر کے سبب ہمارے بعض تخلیق کار بھی ان نامساعد حالات میں رہ کر فکر سخن کرنے پر مجبور ہیں۔ ذہنی کشمکش، نارسائی اور کسی نہ کسی انداز کی محرومیوں کے تذکرے سے صحرائے عرب میں مقیم اردو شاعروں کی تخلیقات بھی بھری پڑی ہیں۔ عجب دلچسپ بات ہے کہ یہاں ہر نوع کی مادی آسائش، فراغت اور آسودگی حاصل ہونے کے باوجود بھی کاسہ تخلیق اشک گرم ہی سے

بھرے ملتے ہیں۔ تاہم تخلیق کار کے زمانی حقائق اور ذہنی و روحانی کلفت و اضطراب سے قطع نظر جو چیز بجائے خود اردو کی شعری کائنات کے حق میں مفید اور قابل قدر ہے وہ ایک نئے ماحول سے حاصل شدہ تخلیقی مواد اور سرمایہ ہے جس کی شعریات اردو کی مانوس شعریات میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔

تخلیقی سطح پر نئی خوشبو ذائقے اور رنگ کی در آمد کے لیے سچ پوچھئے تو ہر مہجری تجربہ اگر وہ سچا اور انوکھا ہے تو نہایت وقیع اور قابل احترام ہوتا ہے۔ چنانچہ اس تناظر میں جب ہم حنیف ترین کی شعری کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو بیشک درد و داغ اور سوز و ساز کے جن مراحل سے وہ گزر رہے ہیں ان سے ہمدردی تو ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ ان کی صعوبتوں کا سلسلہ دراز نہ ہو انہیں مادی آسائشوں میں روحانی سکون بھی میسر آئے لیکن ان کے شعری تجربات میں جو ندرت اور تازگی در آئی ہے ان کا ہم خلوص دل سے استقبال بھی کرتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ حنیف ترین حالات کی ستم ظریفی پر ہمہ وقت روتے بسورتے رہتے ہوں اور اس طرح غمزدگی کو انہوں نے اسلوب زیست بنالیا ہو۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ زندگی کی ابدی صداقتوں کے شاعر ہیں۔ دھوپ اور چھاؤں کا الگ الگ تصور بھی کرسکتے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کو بالقصد اپنے تخلیقی شعور پر مسلط کرنا پسند نہیں کرتے۔ تاہم ان کی بہترین غزلیں اکثر وہی ہیں جو تخلیقی اضطراب اور سوز دروں کی کیفیات سے سرشار ہیں خود بھی اشکوں میں:

ہر زخم کہنہ وقت کے مرہم نے بھر دیا
وہ درد بھی مٹا جو خوشی کی اساس تھا

کیسا نادر و نایاب شعری تجربہ ہے جو ہمارے عہد کی شاعری میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں نے حنیف ترین کی مہجری فکر سے وابستہ جن نایاب شعری تجربات کا ذکر کیا تھا اس کی ایک خوبصورت مثال دیکھی جاسکتی ہے:

رنگوں میں سفیدی کا اثر پھیل رہا ہے
کیا شاخ شجر پر کوئی پتھر نہیں آیا

رنگ، سفیدی، شجر، شاخ اور پتھر کی استعاراتی معنویت کو سمجھے بغیر اس شعر کی تخلیقی انفرادیت کی صحیح داد نہیں دی جاسکتی۔ مہجری فکر کے بہترین نشان امتیاز کے طور پر کچھ اشعار

ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

رشتے ناتے ٹوٹے پھوٹے لگتے ہیں
جب بھی اپنا سایہ ساتھ نہیں رہتا
رہ نوردی کے چمکتے موڑ پر
دھول مٹھی بھر اڑانی اور ہے

مذکورہ شعر میں سایہ خود شاعر کے اپنے وجود کی علامت ہے جس کے معدوم ہونے کی شکل میں رشتے ناتے اور کائنات سے ربط کی کیا صورت ہو سکتی ہے اس کلفت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ دوسرے شعر میں رہ نوردی کے چمکتے موڑ پر مٹھی بھر دھول اڑانے کا تصور بھی اپنے اندر کس قدر ذہنی اذیت رکھتا ہے۔ حنیف ترین کے نازک احساسات کا آئینہ دار ہے۔

حنیف ترین کی تخلیقی کائنات میں مقامی زندگی سے حاصل رموز و علائم بھی ملتے ہیں۔ البتہ ان کی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ یہ لفظیات اجنبی سرزمین کا محض اشاریہ نہیں ہیں بلکہ ایک دل نواز شعری تجربے کا لازمی جز بن گئی ہیں۔ چند اشعار یہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

اچھی گزری ہماری صحرا میں
اب بہاروں کی بات مت چھیڑو

●

ذات کے صحرا سے اب باہر نکل
چل رہی ہیں کالی پیلی آندھیاں

●

دھوپ کی شعلہ فشانی دیکھی
ریت کی سوختہ جانی دیکھی

پہلے شعر میں بہار۔ زندگی کے مانوس جلووں اور نشاط روح کے ضامن مناظر کا اشاریہ ہے۔ صحرا کے تضاد سے محرومی اور نارسائی کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ دید کے قابل ہے۔ دوسرے شعر میں صحرا کی نسبت سے کالی پیلی آندھیوں کا تصور کیا جاسکتا ہے تاہم یہ آندھیاں معمول کے مطابق چلنے والی صحرا کی آندھیاں نہیں ہیں۔ یہ کسی نئی افتاد اور نئی قیامت کا پتہ دیتی ہیں جو سب کچھ تہہ و بالا کرنے کے درپے ہیں۔ تیسرے شعر میں دھوپ کی

شعلہ فشانی اور ریت کی سوختہ جانی کی صحیح داد بے بسی کے اس تصور کو ذہن میں رکھے بغیر نہیں دی جاسکتی جب ان صعوبتوں سے گزرے بغیر زندگی میں کسی راحت کا تصور ممکن نہ رہ گیا ہو۔ تاہم زندگی کے تند و تلخ حقائق کو رقم کرنے والے مہجری شاعر نے صحرائے عرب کی ریتیلی تمازتوں میں بھی اکثر و بیشتر یادِ محبوب کی چادر تان کر اپنی روح کی وادیوں کو شاداب کرلیا ہے:

احساس نارسائی کی بنجر زمیں کو
کس کے خیال سبز نے بالیدہ کردیا
قامتوں کے کئی منظر ابھرے
جب کہیں رت کوئی دھانی دیکھی
احساس نارسائی سے جس دم اداس تھا
شاید وہ اس گھڑی بھی مرے آس پاس تھا

پہلے شعر میں بنجر زمین کے بالمقابل خیال سبز کی بالیدگی اور دوسرے شعر میں قامتوں کے منظر اور دھانی رت کے مابین تعلق کے تصور سے زندگی ایک ایسی لذت سے آشنا ہوتی ہے جو موجودہ تخلیقی فطانت اور غیر معمولی جمالیاتی حس کے ذریعہ ہی حاصل کی جاسکتی تھی۔ ان اشعار سے شاعر کے تصور عشق و جمال پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ شاعری ہر نوع کی سطحیت سے گریزاں اپنی تخلیقی انفرادیت کو بہر صورت برقرار رکھنے پر قادر ہے۔

✡✡✡
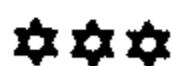
ظہیر غازی پوری

عکسِ غزل نما

ڈاکٹر حنیف ترین آسمانِ اَدب پر ٹمٹمانے والے سیارے نہیں بلکہ شہاب درخشاں ہیں اور گزشتہ دس برسوں سے اپنی نظم و غزل کے ذریعہ دیارِ شعر میں فکر و ہنر کی تابانیاں بکھیر رہے ہیں۔ میرے علم و اندازہ کے مطابق اُن کا عرصۂ شعر گوئی چودہ، پندرہ سال سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس قلیل عرصہ میں وہ دنیائے ادب میں اپنی شناخت اور پنی شعر گوئی کی سند پا چکے ہیں۔ اِس عرصے میں ہندوستان اور پاکستان کے تقریباً تمام اہم اور معیاری جریدوں میں وہ بڑے تواتر اور پابندی سے لکھتے رہے ہیں۔ لہٰذا آج اَدب کا ہر قاری، چاہے وہ دنیا کے کسی گوشے میں سکونت پذیر ہو، ان سے متعارف ہے اور انہیں قابلِ قدر شاعر تسلیم کرتا ہے۔ یہ صرف میرا دعویٰ نہیں ہے بلکہ ہندو پاک کے مستند و مشاہیر اہلِ قلم ہستیوں نے اس سچائی کا اعتراف کیا ہے۔

مثلاً:

''مجھے خوشی ہے کہ حنیف ترین اپنی شاعری میں ایک ایسی راہ نکال رہے ہیں، جس سے اُن کی انفرادیت کا تعین ہو سکے گا۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ

''حنیف ترین کے یہاں تخیلہ بیدار اور شے سے اُس کی شعریت کشید لینے کا میلان توانا ہے۔ اعلیٰ شاعری کے لیے دونوں باتیں ناگزیر ہیں۔''

ڈاکٹر وزیر آغا

''حنیف ترین کا اُردو شاعروں کی صف میں کم و بیش نیا چہرہ ہے۔ نیا ہونے کے باوجود اُن کی شاعری میں وہ سلیقہ ہے، جو آگے چل کر اچھی شاعری کی اساس بنے گا۔

اختر الایمان

''حنیف ترین نئی نسل کے ایک ہوش مند، درد آشنا اور حساس شاعر ہیں۔ انھوں نے

اپنی شعری قوت کا احساس نئے شعری ماحول میں کیا ہے۔''

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

''حنیف ترین کسی گہری معنویت نہیں، گہرے تجربے کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری کی سمت راسخ ہے۔ اس کی شاعری کا واضح عنصر تلخیوں کی شاعری ہے۔

مصور سبزواری

''حنیف کے یہاں بات کہنے کا سلیقہ بھی ہے اور اس پر اُن کی گرفت بھی ہے، وہ علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو پیش کرنے میں عاجز بھی نہیں ہیں۔''

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

''حنیف ترین کے مزاج کی شبابیت سے اُن کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے، جہاں تک مجسمہ سازی کا تعلق ہے، یہ کام وہی شاعر کر سکتا ہے جو ذہنی تصویروں کو استعاراتی صنم بنانے کی ہمت رکھتا ہو۔ دلی دکنی کے بعد یہ خوبی اور خوب صورتی سب سے زیادہ حنیف ترین کے یہاں ملتی ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی

''حنیف ترین کی شاعری کی عمر زیادہ نہیں، مگر اُن کی گرفت کمزور نہیں ہے۔ اس کے کلام کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے خیالات میں تازگی اور اُمنگ ہے۔ اس کے ساتھ ہی شائستگی اور ٹھہراؤ بھی ہے۔''

پروفیسر نثار احمد فاروقی

''حنیف ترین بلاشبہ ایک تازہ کار شاعر ہیں۔ ان کے یہاں اظہار و احساس دونوں میں ایک نیا پن ہے۔ مگر اس نئے پن میں اجنبیت کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حنیف ترین ایک لمبا ذہنی سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔

مخمور سعیدی

شاعری، ڈاکٹر حنیف ترین کے لیے گہرے ذوق وشوق، بلکہ جنون کا درجہ رکھتی ہے، وہ شعر کہتے ہی نہیں شعر جیتے، بھی ہیں۔ شاعری ان کے لیے محض خیال آرائی اور لفظی بازی گری نہیں۔ وہ خواب کے نہیں بیداری کے شاعر ہیں۔ زندگی کی حقیقتوں پر ان کی نظر گہری ہے۔

مظہر امام

ان مُقتدرانِ شعروفن کے علاوہ جناب عتیق احمد عتیق، خواجہ رحمت اللہ جری، رضوان احمد، نعیم احمد قاسمی، معین شاہد، ڈاکٹر سعادت علی صدیقی، کاوش عباسی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر محمد انصار اللہ، ظل الرحمٰن القاسمی، ڈاکٹر وقار خلیل، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، سید قمر حید رقمر، راغب شکیب، ڈاکٹر امام اعظم، عرفان الہدیٰ اور شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی حنیف ترین کی شاعری کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جو انہیں عہد حاضر کا، عصر آگاہ، خوش نظر اور ہر دلعزیز شاعر قرار دینے کے لیے کافی ہے۔

یہ بات باعثِ مسرت بھی ہے، قابلِ رشک اور حیرت انگیز بھی کہ ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنا شعری سفر بڑی تیز گامی سے طے کیا ہے۔ اپنے ابتدائی چند برسوں میں انھوں نے اتنی غزلیں تخلیق کیں کہ ۱۹۹۲ء میں حنیف ترین کی غزلوں کا مجموعہ 'ربابِ صحرا' منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کی مراجعت نظم کی طرف ہوئی اور انھوں نے ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۵ء کے دوران بسیار تعداد میں نظمیں لکھیں کہ نظموں پر مشتمل مجموعہ 'کتابِ صحرا' شائع ہوا۔

ڈاکٹر حنیف ترین ہندو پاک کے علاوہ سعودی عرب، مڈل ایسٹ اور دیگر ممالک کے اربابِ شعروادب سے ربطِ خاص رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی کتابوں کی پذیرائی قریب قریب دنیا بھر میں ہوئی اور ہر جگہ کے اخبار و جرائد میں مضامین، تبصرے، تذکرے شائع ہوئے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ سہ ماہی 'ارتکاز' کراچی، (پاکستان) نے اکتوبر ۱۹۹۵ء کے ضخیم شمارے میں تفصیلی مطالعہ، کے زیرِ عنوان گوشہ حنیف ترین شائع کیا۔ جس میں بیس بائیس رفقائے شعروادب نے ان کی نظم و غزل پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس گوشے نے حنیف ترین کو اعتبار بھی بخشا ہے اور وقار بھی۔

اس مختصر گفتگو سے ایک اہم بات یہ واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر حنیف ترین نے بہت کم مدت میں بہت زیادہ لکھا ہے۔ گویا وہ زود گو اور قلم کے شہنشاہ ہیں۔ زود گوئی اچھی چیز ہے یا بری، اس بحث میں پڑے بغیر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاعر کو وقت میسر ہو اور حالات، دل پر گزرنے والی کیفیات کو بہر لحہ صفحۂ قرطاس پر رقم کرنے پر مجبور کرتے رہیں تو لکھنے کی رفتار تیز ہو ہی جاتی ہے۔ یوں بھی شاعر اگر ایک شعر بھی روزانہ کہے اور عمیق مطالعہ کے ساتھ شعر گوئی جاری رکھے تو ہر دو ڈھائی سال میں بہ آسانی ایک مجموعہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنے تعارفی خاکے میں لکھا ہے کہ انھوں نے ایم بی بی ایس اور ایم ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور ۱۹۸۳ء سے سعودی عرب میں 'وزارت الصحۃ' میں طبیب کے

عہدے پر فائز ہیں۔ بقول نثار احمد فاروقی وہ ''پیشے کے اعتبار سے معالج ہیں'' اور ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں ''حنیف ترین مشہور سرجن ہیں''۔ معین شاہد نے حیرت اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

حنیف ترین جو اپنے وطن سنبھل (ہندوستان) سے دور رہ کر سعودی عرب کے خطہ عرعر (شمال) میں بحیثیت ڈائریکٹر آف ہیلتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں جنہیں شب وروز کی مصروفیت، ادب وشعر کی خدمت کی اجازت نہیں دے سکتی، کس طرح اتنے اچھے، فکر انگیز اور پاکیزہ اشعار تخلیق کر سکے۔''

میرے خیال میں بات بالکل اس کے برعکس ہے۔ ڈاکٹر حنیف ترین کا تقرر عرعر شمال کے سرحدی علاقہ میں ہے۔ وہ کوئی کمرشیل معالج نہیں ہیں کہ انہیں شب وروز کے ۲۴ گھنٹوں میں سے ۱۸ گھنٹے مصروف رہنا پڑے۔ ان کے بیشتر خطوط سے مجھ پر یہی حقیقت عیاں ہوئی ہے کہ عدم مصروفیت، تنہائی، اجنبیت اور غریب الوطنی کے شدید احساس نے انہیں بہر لحہ اپنے کرب واذیت کو لفظ وشعر کے پیکر میں ڈھالنے پر مجبور کیا اور شاعری آہستہ آہستہ ان کا شعار بن گئی۔ قلم اور کاغذ ان کے شریک کار رہے اور فکرِ شعر ان کی تنہائی کی بہترین ساتھی بن گئی۔ اس طرح انہیں عمیق مطالعہ کے ساتھ ساتھ نظم وغزل کے خط وخال سنوارنے اور شعروفن کے نو بہ نو تجربے کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملے اور انھوں نے وقت کا صحیح مصرف لیا اور خوب لکھا۔

انسان کو جب تک گھنے اندھیرے سے سابقہ نہیں پڑتا، اُسے اُجالوں کی طرفگی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بے پناہ غم وآلام سے سربہ گریباں ہونے کے بعد مسرتوں کی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے ہجر کی تنہائیاں، وصل کی شگفتہ یادوں کو تازہ کر دیتی ہیں اور غریب الوطنی اپنے شہر، اپنے دیار کے گلی کوچوں کی دل کشی کا احساس دلا دیتی ہے۔ ڈاکٹر حنیف ترین نے جب رہ گزار عرب کی تپش جھیلی تو انہیں دہلی کی ہمہ ہمی اور کشمیر کی خلد بداماں شادابی ورنگینی پکارنے لگی۔ انھوں نے جب صحرا کی خاموشی، اُس کی چلچلاتی دھوپ، ریت بھری آندھی اور حالات کی سفاکی کو اپنے وجود میں سمیٹنے کی کوشش کی تو اندر کا دہکتا ہوا روشن الاؤ ایک سیال کیفیت بن کر مصرعوں اور شعروں کی شکل میں نوک

قلم کی راہ سے سطح کاغذ پر پھیلنے لگا۔ چونکہ یہ ساری کیفیات نئی تھیں لہٰذا لب ولہجہ، زبان، اظہار کا طریقہ اور ہیئت سب کچھ مختلف تھا، نیا تھا، ہماری پرانی قدروں سے بڑی حد تک الگ تھلگ تھا۔ اس لیے وہی اُن کی منفرد پہچان بن گیا۔

ڈاکٹر حنیف ترین کے داخل کی کائنات کی حقیقت اور خارج کے خواب کا دُھندلکا دونوں ذہن ونظر کو عکس ریز کرنے والے ہیں۔ ان کے اندر شاعری کی شکل میں پلنے والی جو ایک روشنی ہے وہ بجلی کی طرح کڑکنے، لہرانے اور نظر کو چکاچوند کرنے والی ہے۔ ان کے وجدان کو چھونے والی جو ہوا ہے وہ ریگستان کی دہکتی دھوپ میں ہیولے اور بگولے کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اُن کے شعور ولاشعور میں ارتعاش پیدا کرنے والی ایک آگ ہے جو ہر بندش کو توڑ کر شعلہ بننا چاہتی ہے، وہ اُن کی بیدار حس ہے، اور وہ غریب الوطنی اور صحرائے بسیط کے تلخ تجربات اور ہوش رُبا حالات کے شکنجے میں تڑپ رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے شعروں میں ارضِ وطن کی سوندھی خوشبو، درد کی کرب ناک کیفیت، ریگستانی زندگی کی تحیر زدگی اور دنیا بھر میں وبا کی مانند پھیلنے والی قتل وخون کی وارداتوں کا سفاکانہ اظہار بھی ہے، اور انسانی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی قدروں سے ہم کنار ہونے کا والہانہ جذبہ بھی۔ ڈاکٹر حنیف ترین کے اشعار میں المیہ ایک دل نواز طرب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو منفی رجحانات مثبت رویے کا آئینہ دار نظر آتا ہے کیونکہ انھیں یقین ہے کہ حالات کی سنگینی ہی ایک دن انھیں نشاط انگیزی عطا کرے گی۔ اُن کی شاعری کا یہ رجائی پہلو انھیں ایک امتیازی شان عطا کرتا ہے۔

حنیف ترین نے نئے تجربات اور بدلتے ہوئے رجحانات کو ہمیشہ لبیک کہا ہے۔ اُن کی غزلوں میں بھی اجتہادی کیفیت موجود ہے اور نظموں میں بھی نئی نئی ہیئت وتکنیک نظر آتی ہے۔ انھوں نے آزاد غزل بھی کہی، اور ایک عدد آزاد غزل 'ربابِ صحرا' میں شامل بھی کی۔ جب ہیئت، تکنیک اور ساخت کے اعتبار سے ''غزل نما'' کا تجربہ اُن کے سامنے آیا تو انھوں نے اسے ایک الگ صنف کے طور پر قبول کر لیا اور مسلسل ومتواتر غزل لکھتے رہے جو ہندوپاک کے ان موقر جریدوں میں شائع ہوتی رہی ہیں جو شعر وفن کے نو بہ نو تجربات کو بخوشی قبول کرتے ہیں۔

میں سطور بالا میں یہ بات لکھ چکا ہوں کہ غزل نما کی ہیئت وساخت نے سب سے زیادہ ڈاکٹر حنیف ترین کو متاثر کیا۔ انھوں نے گزشتہ تین برسوں میں خاصی تعداد میں غزل نما لکھی ہیں۔ ان کی غزل نما اب تک ماہنامہ 'صریر' کراچی، دوماہی 'گلبن' احمد آباد، سہ ماہی،

ترویج، اڑیسہ، اور دوسرے کئی جرائد میں میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ان کی غزل نما میں بھی وہ تمام شعری خصوصیات موجود ہیں جواُن کی غزل اوراشعار غزل میں موجودرہی ہیں۔غزل نما کسی ایک بحراورایک ہی قافیہ ردیف میں نہیں کہی جاتی ہےاور مضمون شعر کے اعتبار سے بحر کے ارکان میں کمی بیشی کرلی جاتی ہے۔اس لیے ڈاکٹر حنیف ترین کی غزل نما کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے بڑے فنکارانہ انداز میں اپنے احساس اور جذبات کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔زیادہ ارکان والے اشعار میں بھی وہی جاذبیت، دل کشی اور معنوی تہہ داری موجود ہے جوکم ارکان والے شعروں میں موجود ہے۔ان کے اظہار کی سحرانگیزی کبھی کبھی تو یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیتی کہ ہم کم ارکان اورزیادہ ارکان والے اشعار کا مطالعہ کررہے ہیں۔چونکہ غزل نما حقیقتاً غزل کے اندر کا تجربہ ہےاس لیے ان کے اشعار میں غزل کے تمام عناصر جاری وساری نظر آتے ہیں۔ان کی غزل نما کے بعض اشعار کے مطالعے سے یہ ثبوت فراہم ہوجائے گا:

مجھے تاریکیوں کا گھر نہ کہہ دینا
میں سورج کی طرح چھپ کر نکلتا ہوں

☆☆☆
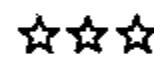
مری پہچان مشکل ہے
میں روز وشب بدلتا ہوں

☆☆☆
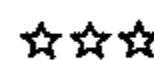
بصیرت ہو تو دیکھو غور سے اک بار مجھ کو بھی
میں تلواروں پہ سوتا ہوں میں بارودوں میں پلتا ہوں

پہلا شعر موضوع کے اعتبار سے منفرد اور اچھوتا ہے۔تاریکیوں کا گھر اور سورج کی طرح چھپ کر نکلنے کے تلازمے جاندار بھی ہیں اور عصری اظہار کے غماز بھی۔صحرائے بسیط میں کس کی ہمت ہے کہ دوپہر کی جھلسا دینے والی تمازت میں باہر نکل پڑے۔وہاں تو شاعر کو اسی طرح چھپنا پڑتا ہے جیسے رات میں سورج۔ڈاکٹر حنیف ترین کی زندگی کو مدنظر رکھئے اور شعر کے پس نظر میں جھانکئے تو شعر ایک نئی کیفیت کا حامل نظر آئے گا۔دوسرا شعر ارکان کی کمی کے باعث آٹھ نولفظوں پر مشتمل ہے اوراس میں بیحد متاثر کن بات کہی گئی ہے۔آج کا المیہ یہ ہے کہ انسان اپنی شناخت کھو چکا ہے۔وہ اجنبی بھی ہے اور تنہا بھی اوراس کا چہرہ بھی اصل چہرہ نہیں

ہے۔ شاعر ہزاروں میل دور ایک ویرانے میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ اپنے مطب میں ایک معالج اور صرف معالج ہے۔ اپنے ریڈنگ روم میں جب قرطاس وقلم ہاتھ میں ہوتے ہیں تو وہ ایک تخلیق کار اور شاعر ہوتا ہے۔ بیڈ روم میں پہنچتے ہی وہ تنہائی کے کرب اور غریب الوطنی کے عذاب جھیلتا ہے۔ یہ اس کا انتہائی اذیت ناک روپ ہے۔ اس تناظر میں اس شعر کا جائزہ لیجیے تو شاعر نے اس حقیقت حال سے آگاہ کیا ہے جس سے وہ سرحدی علاقہ میں ہر لمحہ دوچار رہتا ہے۔ فی زمانہ تو دنیا بھر میں انسان عدم تحفظ کا شکار ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب کوئی دھماکہ ہوگا اور جسم کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ حد تو یہ ہے کہ آج پوری دنیا بارود کے ڈھیر پر بچھی ہوئی ایک بساط ہے۔ اِس سادہ سے شعر میں تباہی کے خطرے اور الم ناکی کے خوف کا جو بیان ہے، دراصل وہی زیادہ اہم اور قابل توجہ ہے۔ ان تینوں اشعار میں مضمون شعر کے مطابق کم یا زیادہ الفاظ میں شعریت کو برقرار رکھتے ہوئے شاعر نے اپنے تجربے اور مشاہدے کا کامیابی سے اظہار کیا ہے۔ اگر شاعر پابند غزل کہہ رہا ہوتا تو شعر وضع کرنے کا انداز اس سے بالکل مختلف ہوتا۔ غزل نما کا فارم اور تکنیک بھی شعر کو نئی فکری جہت سے آشنا کراتی ہے۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی نے آزاد غزل، اور 'غزل نما' کے تجربے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"نئے خیالات اور نئے تجربات تو اسی وقت شروع ہوتے ہیں
جب پرانی ہیئتیں، مضامین اور لفظیات ذہنوں کی تشفی نہ کر سکیں۔"

بلاشبہ 'غزل نما' نے ہیئت، موضوع شعر اور لفظیات تینوں سطحوں پر غزل کے شعر کو توانائی اور ندرت سے ہم آہنگ کیا ہے۔ ڈاکٹر حنیف ترین نے 'غزل نما' کی تخلیق کر کے غزل اور شعر غزل کو تقویت پہنچائی ہے اور نئے تجربوں کو خوش آمدید کہنے کی روایت کو بھی زندہ کیا ہے۔

آیئے ان کی ایک پوری 'غزل نما' کا مطالعہ کرتے ہیں:

یہ کیا ہے تماشہ کہ وہ آئینے دیکھتے ہیں
گریباں جن کے ہمیشہ کھلے دیکھتے ہیں

☆☆☆

ہمارے لہو سے ہیں رنگیں
جو ہم گل کدے دیکھتے ہیں

☆☆☆
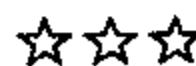
پُرانے نشانات منزل سے آگے
مسافر نئے راستے دیکھتے ہیں

☆☆☆

نظر ان کے بے شک ہے سرمایہ دار حقیقت
ہمیشہ جو سود و زیاں سے پرے دیکھتے ہیں

☆☆☆

حنیفؔ اس زمانے میں ہم بھی
تماشے نئے دیکھتے ہیں

غزل نما کے تقریباً تمام اشعار میں سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ نئی نسل کے شعراء میرؔ کی اس زبان کو رواج دینا چاہتے ہیں جو عوام میں مقبول تھی، اور گلی کوچوں میں بولی جاتی تھی۔ میر نے اپنے شعروں میں عوام سے گفتگو کی مگر وہ خواص میں بھی اتنی ہی زیادہ مقبول ہوئی۔ آج کی شاعری بھی سہل ممتنع کی راہ پر چل پڑی ہے، بعض شعراء کی غزلوں میں تو ایک بھی ترکیب واضافت ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ غالبؔ کی مشکل پسندی اپنی جگہ مگر داغؔ نے ایسی ہی آسان زبان کو اردو شاعری کے لیے مناسب اور مفید قرار دیا تھا۔ ایسی زبان میں کہے گئے اشعار میں لفظ ہی پیکر اور علامت بنتا ہے اور تہہ دار معنویت کا حامل بھی ہوتا ہے۔ حنیف ترین کی زیرِ نظر غزل نما کے مطلع میں ایک تحیر ہے جسے بوالعجبی بھی کہہ سکتے ہیں۔ غالبؔ کا ذوقِ تماشہ کچھ بھی رہا ہو یہاں عالم یہ ہے کہ جن کے گریباں دھجی دھجی ہو چکے ہوں وہ بھی آئینے میں اپنی ''گردش زدگی'' دیکھ رہے ہیں اور وہ بھی جو گریباں کھلا رکھ کر اپنے جسم شیشہ صفت کی نمائش کرنا چاہتے ہیں۔ آج گُل کدے کے چمن زار میں ہوں یا ایسے محلوں میں جہاں سے منو… سونے چاندی برآمد ہوتے ہیں۔ اُن میں عام آدمی کا لہو نظر آئے گا اگر ہم ان کی تہہ میں اتر کر دیکھ سکیں۔ وقت کہیں ٹھہرتا نہیں۔ راستے اور منزلیں بدلتی ہیں، رکھ رکھاؤ بدلتے ہیں، فکر و رجحان میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔ زندگی کی دوڑ میں ہر مسافر جس میں فنکار بھی شامل ہے، نئے راستے اور نئی آگہی کی جستجو میں ہے، صحیح معنوں میں یہ جہد حیات ہے جو اسرار کو منکشف کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سود و زیاں سے پرے دیکھنے والے انسان ہی کامیابیوں کی انتہائی بلندیوں کو چھوتے ہیں اور وہی حقیقت کا عرفان بھی رکھتے ہیں۔ ان کی نظر محدود اور لامحدود کے منظر نامے میں ہر شے کو دیکھتی

ہے۔لہٰذا اسے سرمایہ دار حقیقت قرار دینا بڑی معنیٰ خیز بات ہے۔تماشے تو روز ازل سے ہو رہے ہیں۔ان کی نوعیت بھی عجیب وغریب ہوا کرتی ہے ورنہ انہیں تماشے کا نام کیوں دیا جاتا۔موجودہ زمانے میں بھی سیاسی بازی گری سے لفظی بازی گری تک نت نئے تماشے ہوتے رہتے ہیں جنہیں شاعر دیکھتا بھی ہے اور جھیلتا بھی ہے،مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔

اس مختصر تجزیئے سے یہ بات زیادہ واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر حنیف ترین غزل اور نظم کی طرح غزل نما کہتے وقت بھی نئی حسیت اور معنوی طرحداری کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ان کی غزل نما میں روحانی فضا بھی ہے، زندگی کی تلخ حقیقت بھی اور اجتماعی کیفیت بھی۔ بقول گوپی چند نارنگ ''حنیف ترین کی امیجری اور موضوع میں تنوع ہے۔'' اور بقول مظہر امام ''حنیف ترین خواب کے نہیں بیداری کے شاعر ہیں اور زندگی کی حقیقتوں پر ان کی نظر گہری ہے، ان کی غزل نما کے اشعار میں جابجا رمزیت کی تابناکی، موضوع کی رنگا رنگی اور حقائق کا بے باکانہ اظہار موجود ہے جو قاری کو ہر سطح پر متاثر کرتا ہے۔''

مجھے یقین ہے ڈاکٹر حنیف ترین کی غزل نما کا مجموعہ ''کشتِ غزل نما'' اپنی انفرادیت اور تجربے کی خوش آہنگی کے باعث شعر وادب کی دنیا میں سنجیدہ قارئین کے لیے ایک نادر اور گراں قدر تحفہ ہوگا جو فکر ونظر کو نئی سمتوں اور نئے موسموں سے روشناس کرانے میں کامیاب ہوگا۔

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد
پروفیسر شعبۂ اردو، بی، این کالج، پٹنہ یونیورسٹی

حنیف ترین کی غزل گوئی

ویسے تو ہر اچھا شاعر نہ صرف اپنی شعری روایت سے واقف ہوتا ہے بلکہ اس روایت کی بدلتی ہوئی جہتوں (Dimensions) پر بھی نگاہ رکھتا ہے مگر غزل گو شاعروں کے لیے یہ اور بھی ضروری ہے۔ غزل گوئی کی بھیڑ بھاڑ والی دنیا میں اپنی شناخت بنانے کے لیے روایت سے آگہی، انفرادی شعور کا اظہار، رمزیت اور تخلیقی تہہ داری کلیدی عناصر کہے جاسکتے ہیں۔ یہ چیزیں ہاتھ آجائیں تو پھر شاعر اپنے داخل کی کائنات میں سفر کرے یا خارج کے مظاہر کا مشاہدہ و مطالعہ کرے، ہیئت اور تکنیک کے تجربے کرے یا نامانوس قوافی و ردیف سے کام لے، اس کی انفرادیت برقرار رہتی ہے۔ یہ صورت حنیف ترین کی غزل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے یہاں موضوعات تکنیک اور اسالیب کا حیرت انگیز تنوع ملتا ہے بلکہ میرے خیال میں ان کی شاعری بشمول غزل گوئی کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اسے کسی روایتی دائرے میں قید کرنا مشکل ہے۔ یہ احساسات و تجربات کے آزادانہ اظہار کا ایسا نمونہ ہے جسے پوری طرح کسی بھی نظریاتی دائرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ فنی اعتبار سے بھی انھوں نے خود کو محدود نہیں کیا ہے۔ چھوٹی بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور طویل بحروں میں بھی، اساتذہ کی زمینوں میں بھی اشعار کہے ہیں، خود بھی مشکل زمینیں نکالی ہیں اور آزاد غزل سے آگے بڑھ کر 'غزل نما' کا تجربہ کیا ہے۔ مگر ان کی انفرادیت ہر جگہ بہ آسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔

حنیف ترین کی ابتدائی غزلوں کے اشعار بیک نظر غزل کے کلاسیکی سرمائے سے ان کی گہری واقفیت کا احساس دلاتے ہیں۔ دل لگانا اور دل پہ چوٹ کھانا، پھر محبوب کی یاد میں زندگی گزارنا، شب تنہائی میں اس کی یادوں سے چراغاں کرنا اور اس کے غم کو سرمایۂ حیات سمجھنا، یہ تمام امور جو اردو کی کلاسیکی غزلوں میں کثرت سے بیان ہوتے رہے ہیں، حنیف ترین کے یہاں بھی دکھائی دیتے ہیں مگر لب و لہجے کی انفرادیت کے ساتھ چند مثالیں کافی ہوں گی۔

شور جب سوگیا جاگی وحشت
پھیلا یادوں کا دھواں گلیوں میں
پلکوں پہ نارسائی کی کچھ بدلیاں حنیف
ناسور بن کے دل کی زمیں پر برس گئیں
خزاں میں اوڑھ کے قول وقرار کا موسم
بہار ڈھونڈ رہی ہے بہار کا موسم

دل شکستگی اور ہجر ووصال کے یہ موضوعات ادبی سفر کی اگلی منزلوں پہ بھی ان کے ساتھ رہتے ہیں مگر رفتہ رفتہ ان کا میلان بدلتا جاتا ہے۔ تلاش رزق میں دیار غیر کا سفر کرتے ہوئے وہ طرح طرح کے تجربات اور مناظرِ حیات سے آشنا ہوتے ہیں۔ زندگی کی برق رفتاری کے سبب آج کل یوں بھی صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے، والا مامله ہے۔ اس لیے وہ شکست خواب کے حصار سے باہر نکلتے ہیں تو ایک رنگ برنگی دنیا سامنے آتی ہے۔ آدمی کی ازلی وابدی نیکی وبدی اور شہہ زوری وکمزوری کے نتیجے میں ابھرنے والے سوالات تو انہیں متاثر کرتے ہی ہیں مگر وہ عالمی طاقتوں کی سازش اور رسہ کشی بھی دیکھتے ہیں اور عرب حکمرانوں کی عیش کوشی اور مجرمانہ خاموشی بھی۔ اگر ایک طرف وہ اپنی شخصیت کے آئینے میں سعودی عرب میں کام کرنے والے غیر ملکیوں کی تنہائی، اجنبیت اور مظلومانہ بلکہ غلامانہ حیثیت کا مشاہدہ کرتے ہوئے افسردہ ہوتے ہیں تو دوسری طرف خود عرب معاشرے میں متوقع انقلاب کی آہٹ انہیں شادماں ہونے کا بھی موقع فراہم کرتی ہے اور غور وفکر کا بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام امور ان کی شاعری میں جگہ پاتے ہیں تو اسے ایک وسیع کینوس دیتے ہیں اور اسی اعتبار سے شہرت ومقبولیت کی ایک دنیا بھی۔ لیکن ان کی انفرادیت اور عظمت کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ اب ان کے یہاں ایک خوش گوار تخلیقی توانائی، تہہ داری اور معنویت کا احساس زیادہ واضح طور پر ہوتا ہے۔ لفظوں کا انفرادی اور تخلیقی استعمال ان کے شعور کی بلوغت، تجربات واحساسات کی پختگی اور فکری آراستگی کا پتہ دیتا ہے۔ جیسا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کے تازہ ترین مجموعۂ کلام ''زمین لاپتہ رہی'' کی ابتدا میں اشارہ کیا ہے، رفتہ رفتہ دنیا کی تہہ داری کو جاننے کے ساتھ ساتھ لفظوں میں چھپے ہوئے گنجینۂ معانی سے واقفیت حاصل کرنے کی صلاحیت بھی ان میں پیدا ہونے لگی ہے۔ ظاہر ہے کہ براہ راست بیانیہ لب ولہجے کے ساتھ ساتھ اس طرح کے اشعار کہنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے:

کیسے کھلے یہ ماجرا، چہروں کی اصلیت ہے کیا
شہر ہوس کی بھیڑ میں، جو ہے نقاب پوش ہے

☆

نیک و بد میں کوئی تمیز نہیں
یہ زمانہ بھی کیا زمانہ ہے

☆

خامشی کا مذاق اڑانا ہے
آج پھر قہقہہ لگانا ہے

☆

مصلحت کی گرد سر سے جھاڑ دے
پھر ارادوں کو جنوں کی آڑ دے

☆

جو گر کے اٹھتے رہیں ان کا ہارنا مشکل
جو سر سے باندھیں کفن، ان کو مارنا مشکل

☆

جہاں پہ ظلم کو قسمت سمجھ کے لوگ جئیں
وہاں تو میرے لیے دن گزارنا مشکل

یہ اشعار مقبول ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں مگر جو اشعار نئے پیکروں سے حنیف کی قربت، لفظوں کے ساتھ ان کے منفرد برتاؤ اور Treatment یا ان کے روشن مستقبل کی ضمانت کے گواہ بن سکتے ہیں وہ کچھ اور ہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہی وہ اشعار ہیں جو غزل گو شاعروں کی بھیڑ میں ان کی علیحدہ شناخت متعین کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ یہاں بھی چند مثالیں کافی ہوں گی:

رہ نوردی کے چمکتے موڑ پر
دھول مٹھی بھر اڑانی اور ہے

تند ہواؤں میں جو پربت ساکت ہے
وہ بھی کروٹ بدلے گا کل پرسوں میں

ہر جگہ پتھروں کی بارش ہے
سر دعاؤں سے ڈھک لیا جائے
رنگوں میں سفیدی کا اثر پھیل رہا ہے
کیا شاخ شجر پہ کوئی پتھر نہیں آیا
ہے ظلمت میں سورج نکلنے کا غم
اجالوں سے شب کو جھلنے کا غم
جب بجے گی شاخ پتھر آئیں گے
پیڑ سے پھولوں پھلوں کو جھاڑ دے

یہ مثالیں بلا تخصیص پیش کی گئی ہیں۔ مگر ''زمین لا پتہ رہی'' کی غزلیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ شاعر کے یہاں اس طرح کے اشعار کی تعداد پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ بلکہ کم وبیش ہر غزل میں اس نوعیت کے دو تین اشعار مل جاتے ہیں جو ان کے فکر و اظہار کی پختگی کا ثبوت ہیں۔

یہاں ایک نکتے کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ حنیف ترین پتہ نہیں کیوں بار بار اپنی غزلوں کے بارے میں (لفظوں کے بارے میں بھی) یہ لکھتے ہیں کہ ان میں کہیں آپ کو اپنے محسوسات و مشاہدات کی جھلک بھی نظر آ جائے تو اسے میں اپنی کامیابی سمجھوں گا۔ ظاہر ہے کہ فنکار کا تجربہ اگر سچا ہے تو وہ دوسروں کا تجربہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے۔ یہی بات ''مشاہدات ومطالعات'' کے حوالے سے بھی کہی جا سکتی ہے اور بلاشبہ اہمیت کی حامل ہے مگر فن کی عظمت طے کرنے کے سلسلے میں 'حرفِ آخر' نہیں۔ اصل اہمیت وسیلے (الفاظ) کے تخلیقی استعمال کی ہے۔ قاری کا کسی شاعر کے تجربات و مشاہدات میں شریک ہونا شاعر کی عظمت کے لیے کافی نہیں۔ تجربے مشترک ہو سکتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں مگر اظہار مختلف ہوتا ہے اور شاعر کی انفرادیت اسی سے طے ہوتی ہے۔ حنیف ترین یہ نکتہ پیش نظر رکھیں تو بہت آگے جا سکتے ہیں۔

آخر میں بس دو باتیں اور ـــــــ ایک تو یہ کہ میں نے اپنے اظہار خیال کو حنیف ترین کی غزلوں تک ہی محدود رکھا ہے۔ حالانکہ ان کی نظمیں بھی اپنے موضوعات، شدت احساس اور امیجری کے سبب خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ وطن کی یاد اور ناسٹلجیا کا بیان بھی نظموں میں زیادہ واضح اور جاندار انداز سے ہوا ہے۔ جب کہ ان کی غزلوں میں اپنوں سے دوری کے احساس سے

جنم لینے والے جذبوں کے ساتھ ساتھ عصری آ گہی اور اس آ گہی کے نتیجے میں شاعر کے منفرد ردِّعمل کا بہ آسانی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ سعودی عرب میں قیام کے دوران ناموافق مشاہدات وتجربات انہیں کسی منفی رجحان یاDepression میں مبتلا کرنے کے بجائے ایک مثبت فکر عطا کرتے ہیں۔ وہ عام مہاجرین کی طرح خاموشی کا زہر اپنے رگ وپے میں بسائے ہوئے صرف تلاش رزق میں مشغول رہنا نہیں چاہتے بلکہ لبوں کے ہاتھ میں گویائی کا عصا دینا اور اندھیری رات کی سڑکوں پہ چاند اتارنا چاہتے ہیں۔ دھوپ، ریت، دشت اور برف جیسے سامنے کے الفاظ نئی معنویت سے ہم کنار ہوکر ایک لطیف صدائے احتجاج میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ میں ان اشعار کا پہلے بھی حوالہ دے سکتا تھا مگر ان کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرانے کے لیے انہیں آخر میں پیش کررہاہوں۔

اٹھیں گی ریت سے جب بھی جنوں کی آوازیں
تو دشت بیڑیاں اپنی بجا رہاہوگا

برفاب ہوچکے جو بکھرنے کے خوف سے
ان موسموں کو دھوپ کی یلغار چاہئے

فنا کے خوف سے احساس سرد ہیں جن کے
انہیں کڑی سے کڑی دھوپ کی سزادینا

تہوں میں ریت کی عجیب سسکیاں ہیں دور تک
سوار دھول پر ہوا کی ہچکیاں ہیں دور تک

دھوپ کی دشت دشت یورش ہے
سیل باراں تری نوازش ہے

نظمیہ ابعاد

ڈاکٹر فہیم اعظمی
مدیر ماہنامہ ''صریر'' کراچی

فطری میلان

شعری مجموعہ ''زمین لاپتہ رہی'' غزلوں، پابند اور آزاد نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی ہر نظم تمثال کا نمونہ ہے جس میں شاعر اپنے جذبات، احساسات، مشاہدات و خیالات کو لفظوں میں قید نہیں کرتا بلکہ ان سے الگ تھلگ کھڑے ہو کر ان کے اثرات کو بیان کرتا ہے جو ان مشاہدات اور تجربات یا جذبات سے مرتسم ہوتے ہیں۔ اظہاریت (EXPRESSIONISM) کی یہ تیکنیک ''زمین لاپتہ رہی'' کی بیشتر نظموں میں ملتی ہے۔

جوشِ مستی میں ساعت کھو گئی
اور ہستی بھی کہیں گم ہو گئی

....

بود اور نابود کے غم سے پرے
لمحۂ جاوید میں حیراں رہا
خود کو پا کر
خود سے
تھا
میں ماورا

عرفان کے عنوان سے یہ نظم اس کیفیت کو بیان کرتی ہے جو صبح کی اذان اور ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کی آواز پر ہوتی ہے۔ شاعر کو اپنے وجود کا احساس ہے مگر اللہ کے حضور وہ اپنے کو مادی وجود سے بلند محسوس کرتا ہے اور اسی کیفیت کا تسلسل مذہب اور قلندر کے ذکر تک لے جاتا ہے جنہیں اگر عنوان کے بغیر پڑھا جائے اور پہیلی کے طور پر پوچھا جائے:

رہ نوردی کے چمکتے موڑ پر

دھول مٹی پھر اڑانی اور ہے
جو ملا کب تھا بقدر تشنگی
گویا لب کی بیکرانی اور ہے
نا مساعد ذات کے ابہام میں
ہم نے اب کے دل میں ٹھانی اور ہے
آزمودہ دھند کے آگے حنیفؔ
کوشش نقل مکانی اور ہے

....

تیرگی کے درمیاں تھی زندگی
کیوں نہ ہوتی وجہ صد رخشندگی

....

ذہن و دل میں آسمائے آفتاب
فکر و دانش کو ملے رخشندگی

''دیوانوں کا نام ابد تک'' انسان کے فنی ذوق اور آرٹس کے میدان میں جدوجہد کی خوبصورت تمثیل ہے:

سنا ہے اس نے پڑھتے پڑھتے
آنکھوں کو تیران کیا ہے
صدیوں پر پھیلی ان دیکھی
روشنیوں کا گمان کیا ہے
(پل دو پل وشرام کیا تھا)
سنا ہے اس نے لکھتے لکھتے
دفتر میں اپنے جیون کے
دن کاٹے تو
راتوں کا وردان دیا ہے

....

اپنے آرٹ کے تاج محل میں
اک تصویر سا لٹکا ہوا ہے

یہ کسی بھی لافانی فنکار کی تصویر دیکھ کر زندگی کی یاسیت لیکن عزم انسان کی رفعت لیکن فنا ہونے کی حقیقت کی عکاسی ہوسکتی ہے۔ زمان و مکان سے ماورا۔

چند مختصر نظموں ''خود کو اچھا لگتا ہوں'' خواہشوں کے گیت اور ''امید پہ دنیا قائم ہے'' میں انسان کی نرگسیت یا EGOISM رومانی جذبہ اور آس و یاس کے اجالے اندھیرے کی ذہنی کیفیت۔ کنایہ اور علامت نگاری کی مثالیں ہیں اور ذات سے ہٹ کر سماج کی ترجمانی ''بند گھروں میں کئی زبانیں لٹکی ہیں'' چند سطروں میں ایک بیوی کا غم جس کی سوت بھی ہے اور اسے ضبط اور امید کی تلقین:

ام بشیرہ کیوں روتی ہے
سوت کا غم بے جا ڈھوتی ہے

....

تاب ضبط وہ لئے ہوتی ہے
جس کی دھن اور تال کا ثمرہ
سورج خوشیوں کا موتی ہے

ایک لازمانی اور لامکانی نظم مگر ہمارے معاشرے کی عکاسی جہاں دوسری شادی معمول نہیں بلکہ ظلم ہے۔

''زمین لاپتہ رہی'' کی بیشتر نظمیں تمثال کی کارفرمائی اور اختصار میں تفصیل کے لطف کی حامل ہیں۔ اس مجموعے میں کچھ ایسی نظمیں ہیں جو شعری زبان میں معروضی وارداتوں کو بیان کرتی ہیں۔ ایسی ہی ایک نظم ''ایک خیال آتا ہے'' میں شعوری رو (STREAM OF CONSCIOUSNESS) کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور کئی وارداتیں مل کر ایک خوبصورت افقی SYNTAGMATIC شعوری بیانیہ کو جنم دیتی ہیں جن میں منطقی رشتہ ہونا ضروری نہیں۔ پوری نظم میں شعور کی رونمایاں ہوتی ہے۔

اسپتال میں آنے کی کہانی، کسی کی یاد جس کے پیار نے ''کس قدر سنوارا ہے'' اور پھر چار مشفق و ہمراز کا شکوہ جو ''آج تک نہیں آئے''۔ یہ جاننا مشکل ہے کہ اسپتال میں آنے کا سبب

بیماری ہے یا نوکری اور چار مشفق و ہمراز کون ہیں۔ دوسرے ہی لمحے شاعری کا خیال اور خوبصورت نظمیں اور غزلیں لکھنے کی خواہش اور پھر ناسٹلجیا۔ گھر کی یاد، بیٹے بیٹیوں کی یاد اور ایک دم سے تلخ خیال کہ بڑھاپے میں رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ALIENATION یا تنہائی زندگی کو تلخ بناتی ہے۔ اس کے بعد ایکسیڈنٹ کا ذکر اور مقامی پولیس اور حکومت کے اہلکاروں سے واسطے کا خیال اور قاری سوچنے لگتا ہے ''کیا یہ کوئی ایکسیڈنٹ تھا جس کے نتیجے میں شاعر ہسپتال میں داخل تھا اور ناسٹلجیا کا شکار تھا؟ پھر شاعر مقامی پولیس اور حکومت کے عمال کے رویہ کو ریشنلائز کرتا ہے۔ قبائلیوں کی تعریف اپنے ایک قبائلی دوست کے حوالے سے کرتا ہے اور کسی سعودی امیر ابو محمد کی تعریف کرتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا ریشنلائزیشن اپنے ملک (جس سے ہندوستان مراد ہے) اور وہاں کی سیاست کا ذکر، بیوروکریسی کے غلط رویوں کی جانب اشارہ۔ سعودی عرب میں شاید ایکسیڈنٹ کے بعد پولیس اور حکومت کے سخت رویہ کا شکوہ جو اس کے تجربے میں آئے۔ ان کے ریشنلائزیشن کے بعد، اپنے ملک یعنی ہندوستان کی سیاست کا ریشنلائزیشن، جمہوری اقدار کی پسندیدگی کا اظہار اور کچھ پسندیدہ سیاسی لیڈروں کا ذکر۔ پھر ایک اور ریشنلائزیشن، زندگی کو ایک تماشا کہہ کر روٹی اور بوٹی اور جنسی بے راہروی کا شکوہ۔ اس کے بعد شاعر کا خیال کشمیر کی جھیل ڈل کی جانب جاتا ہے جہاں عشق و محبت، کامیابی و ناکامیابی اور ٹھہراؤ، کسی لڑکی پر مرتکز خیال جس کی امارت اور آنکھوں میں پیار کی باتوں کی ڈپلومیسی کو نہیں پہچانا۔ ان رومانی یادوں کے بعد شعر کا ذوق ابھرتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اپنی عشق و محبت کی کہانی علامتوں میں بیان کرے۔ اور جدت کا شہزادہ بن کے ابھرے۔ ابھی تک ''زمین لاپتہ رہی'' کی نظموں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاعر کی مراد بر آئی اور وہ یقیناً جدید حسیات، لہجے اور اسلوب کا شاعر ہے۔

اور پھر شاعر کی شعوری رو اُسے اس لڑکی کی طرف لے جاتی ہے جو شاعر سے اس وقت ملنے آئی تھی جب بوڑھے باپ کی سانسیں اور ماں کی ڈوبتی آنکھیں زندگی کے صحرا میں نظر آرہی تھیں۔ یہ کون سی لڑکی تھی؟ کیا وہی پہلے والی؟ خود ملنے آئی تھی؟ کیا باپ اور ماں بستر علالت یا مرگ پر تھے؟ قاری ان باتوں کو اخذ کرسکتا ہے مگر مطلق ابلاغ کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور یہی جدید ادب کے معنی کی تکثیریت ہے۔ پھر شاعر کی شعوری رو ہمیں ایک اور لڑکی کی جانب لے جاتی ہے وہ جو اس کے پاس ہے اور اس کی ساتھی ہمہ وقت کی، اور یہاں وہ زندگی سے بلکہ خوشگوار زندگی سے سمجھوتا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے رومانی خیالات اور جذبات میں ٹھہراؤ کے بعد وہ اپنی جیتی

جاگتی زمیں کی جانب لوٹتا ہے۔ انسانیت کی موت کا خیال آتا ہے۔ دہشت گردی کا، بم دھماکوں کا، ایٹمی ہواؤں کا۔ اوران کے اثرات کا۔ اس وقت شاعر میں انسانی قدریں جاگ اٹھتی ہیں:

ایٹمی ہواؤں سے
سب کو خوف آتا ہے
اس لیے مرے بھائی
پیار میں جئیں ناچیں
سب بنے ہیں مٹی سے

پھر ایک اور شعوری رو جو ایٹم کی توانائی اور ثقل کی کارکردگی کی جانب لے جاتی ہے لیکن فوراً ہی جذبۂ انسانیت لوٹ آتا ہے۔ انسان کی ایک دوسرے سے نفرت اور جنگ و جدل کا خیال آتا ہے اور وہ مواعظی رنگ میں لوگوں سے کہتا ہے:

آؤ اے حسیں لوگو
غم کو بھول کر ہم سب
پیار بانٹ لیتے ہیں
سرحدوں کی دیواریں
مل کے اب گرادیں ہم

اور شاعر و ادیب کے لیے یہ سرحدیں سیاسی اور جغرافیائی نہیں بلکہ آرٹ، ادب اور انسانیت کی سرحدیں ہوتی ہیں۔ پھر اسے جسمانی تکلیف ہوتی ہے اوراس ایکسیڈنٹ کو یاد کرتا ہے جس میں وہ زخمی ہوا تھا۔ شاید اسے درد ہو رہا ہے۔ اوراس کی شعوری رو منقطع ہو جاتی ہے۔ نظم ختم ہو جاتی ہے۔

نظموں کی طرح غزلوں میں تصوف کی باریکیاں نظر آئیں گی مگر نظموں کی طرح اظہاریت یا تمثال کی کارفرمائیاں نہیں ہیں۔ لیکن سہل ممتنع میں بہت سے اشعار ہیں جو معنویت کے حامل ہیں۔

کچھ غزلوں میں مواعظی اشعار ہیں مثلاً

بٹے ہیں فرقوں میں جو رہنما کی چالوں سے
اب ان سے طوق غلامی اتارنا مشکل ہے

غزلوں میں آٹھ ''غزل نما'' شامل کی گئی ہیں۔ غزل نما کے رائد ظہیر غازی پوری ہیں مگر زیر تجزیہ مجموعے کے خالق اس صنف کو وسعت دینے میں پیش پیش رہے ہیں۔

جہاں تک ''زمین لا پتہ رہی'' کے ''مجموعی تاثر'' کا تعلق ہے تقریباً تمام غزلیں اور نظمیں جدید شاعری کی نمائندگی کرتی ہیں۔ طرز اظہار شگفتہ اور موثر ہے۔

کتاب کے عنوان اور سرورق پر غور کرنے سے کئی معنی ذہن میں آتے ہیں۔ کیا تصویر کا مفکر وہ زمین تلاش کر رہا ہے جو گلوب پر نہیں ہے۔ کیا وہ فکروفن کی زمین ہے جو لجنڈ فنکار کو اس کی زندگی میں نہیں ملتی اور منزل پر پہنچنے کی کوشش ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ کیا یہ حب لوطنی اور ناسٹلجیا ہے جو مسافرت میں اسے شاعری میں منہمک رکھتا ہے، یا یہ کہ شاعر زمین سے ماورا تصویر وجدان کے تحت غزلیں اور نظمیں تخلیق کر رہا ہے۔ اور زمین یا اس کی مادی آماج گاہ اسے دکھائی نہیں دے رہی۔ سرورق خانۂ فرہنگ جمہوریہ اسلامی ایران کے توسط سے شائع ہوا ہے۔ اس لیے گمان ہوتا ہے کہ کسی اسلامی یا ایرانی مفکر کی تصویر ہے جو ایسی ہی زمین کی تلاش میں ہو جو مادی زمین سے الگ ہو جو اس کے سامنے رکھے ہوئے گلوب میں نظر آ رہی ہے۔ اور اس طرح عنوان اور سرورق دونوں میں کثیر المعنویت آجاتی ہے اور یہی جدید اور کامیاب شاعری کی مثال ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری

حنیف ترین: ذہین وذکی الحس شاعر

نئی نسل کے شعری اظہارات کو اردو شاعری کی وقیع اور تسلسل پذیر روایت کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یا تو وہ شعراء سامنے آتے ہیں، جو جدت پسندی کی خواہش کے باوجود روایت پرستی کی حد تک روایت سے منسلک ہونے کے رجحان کو ظاہر کرتے ہیں اور روایت رہی کی توسیع کرتے نظر آتے ہیں، یا وہ شعرا ہیں جو شعوری طور پر روایت سے رشتہ قائم کرنے کے باوجود جدت پسندی کو ہی اپنا مسلک بناتے ہیں اور اسے روایت کے اقدار پر ترجیح دیتے ہیں۔ شعراء کی ایک تیسری قسم وہ بھی ہے جو روایت اور جدت میں ایک معنویت افروز توازن قائم کرتی ہے یعنی جس قدر ایسے شعرا روایت کی پاسداری کرتے ہیں اتنا ہی وہ جدت پسندی کے رجحان کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ حنیف ترین جدید شعراء کی دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ روایت کے اثرات کے باوجود روایت سے کنارہ کر کے جدت پسندی کو اپنی پہچان بنانے پر مصر نظر آتے ہیں اس لیے جہاں ان کو روایت کی بندشوں سے آزاد ہونے اور غیر مشروط اور کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا ہے وہاں انھیں روایت کے رچاؤ اور نفاست سے دور ہونے اور جدت کے جوشیلے، تجرباتی اور غیر منضبط اظہار سے قربت حاصل رہی ہے۔

روایت اور جدت کا یہ انوکھا امتزاج، اور اس سے پیدا ہونے والے شعری اظہار کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ شاعر کی خارجی زندگی کے بدلتے اور غیر موافق حالات سے ٹکرانے پر ان کے فوری نوعیت کے ذہنی اور جذباتی ردعمل (Response) سے گہری مطابقت قائم کرتا ہے چنانچہ ان کی شاعری میں ایک ایسا متلون مزاج کردار ابھرتا ہے جو اپنی سادہ اور معصومانہ سرشت کے مطابق دنیوی قسم کے لوگوں سے ذہنی تجسس اور جذباتی ارتعاشات کے ساتھ معاملات کرتا ہے اور جن آرزوؤں، ارمانوں، حیرتوں، شکستوں اور حسرتوں سے وہ گزرتا ہے وہی اس کا سرمایہ حیات

بن جاتی ہیں۔ اس طرح سے وہ داخلی ردعمل کی سچائی اور خلوص پر حاوی ہو جاتا ہے اور بہت حد تک ان نام نہاد جدید شعراء سے الگ ہو جاتا ہے، جو اوروں کی دیکھا دیکھی اجنبیت، گم شدگی اور تنہائی کے موضوعات چن چن کر ان کی مالا جپتے ہیں۔ یہ حنیف ترین کی ہوش مندی ہے کہ وہ شروع سے ہی بھیڑ چال چلنے پر رضامند نہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے ذاتی محسوسات کو سچائی کے ساتھ حرفوں کا پیکر عطا کرنے کی سعی کی ہے۔

حنیف ترین کی شاعری میں نمود کرنے والا کردار خارجی حالات سے آنکھ ملاتے ہوئے اپنی ذات کو نظر انداز نہیں کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا سفر ذات سے ہی شروع ہوتا ہے اور ذاتی سطح پر انسانی معنویت سے رشتہ جوڑتے ہوئے تجربے جو بنیادی طور پر جذباتی اور جبلی اصل سے منسلک ہیں۔ ان کے اشعار میں نمود کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ذہن و دل کی بدلتی کیفیات جسم کی قربتیں و جنسی تقاضے، رشتوں کا تقدس، دوریاں، رفاقتیں، آزردگیاں، واہمے، ایقان اور فریب شکستگی شخصی آب و رنگ لیے جھلکتی ہیں اور ایک رومانی فضا کو ابھارتی ہیں۔ یہ ساری کیفیات ایک ایسے سادہ و معصوم مگر ہوش مند بچے کی ہیں جو بلوغت سے گزرتے ہوئے بھی ''بچپن کے سات رنگوں'' کو عزیز رکھتا ہے، اور اپنی ذہانت اور ذکی الحسی کی بنا پر بقول ورڈس ورتھ ''انسان کے باپ'' کی حیثیت اختیار کرتا ہے اور رومانی مثالیت پسندی کی تمثیل بن جاتا ہے۔

تابش حرف وصوت سے بڑھ کر
زندگی میں کوئی جمال کہاں

محفل میں پھول خوشیوں کے جو بانٹتا رہا
تنہائی میں ملا تو بہت ہی اداس تھا

بال کھولے کس نے یہ صحراؤں میں
اُمڈیں ہر سو کالی کالی بدلیاں

دھوپ کی دشت دشت یورش ہے
سیل باراں تری نوازش ہے

مل کے بچپن کے سات رنگوں سے
تتلیوں کی طرح اڑا جائے

ہر جگہ پتھروں کی بارش ہے
سر دعاؤں سے ڈھک لیا جائے

خامشی کا مذاق اڑانا ہے
آج پھر قہقہہ لگانا ہے

حنیف ترین ایک بالغ نظر انسان کی طرح ملکی اور عالمی سطح پر زندگی اور اخلاق کی ذی احترام قدروں کی پامالی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پراگندگی اور تباہی پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس غیر انسانی صورت کے محرکات وعوامل سے صرف نظر کر کے ایک سادہ، رومان پسند اور خواب بیں انسان کی طرح آدرشوں کی شکست کی المناکی کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کا تجربہ فکری نوعیت کا نہ سہی، جذباتی اور ذہنی نوعیت کا ضرور ہے، اور اپنی سچائی کا احساس دلائے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی بیشتر چھوٹی بڑی نظمیں اس کی مثال ہیں۔

حنیف ترین کے یہاں فطری جذبۂ اظہار کے حاوی رویے نے انھیں روایتی الفاظ و تراکیب کے بوجھ تلے دبنے سے بچالیا ہے۔ انھوں نے روزمرہ کی سادہ زبان کو فارسی آمیز لسانی روایت پر ترجیح دی ہے۔ اس سے ان کے کلام میں تازگی کا احساس ہوتا ہے اور قاری کو اس سے موانستی رویہ پیدا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جوں جوں وہ غیر صیقل شدہ لفظ و پیکر کے استعمال میں تامل برتیں گے اور اپنی عجلت پسندی (جوان کے رومانی مزاج ہی کا مظہر ہے) پر حاوی ہوں گے، ان کے اشعار نئے برگ و بار لے آئیں گے۔

✪ ✪ ✪

فاروق نازکی

دھرتی پوجا کی ایک اور مثال

نہ چاند چمکا
نہ تارے ٹوٹے
نہ گردشیں ہیں
میری نظر میں وہ شب نہیں ہے
کہ جس کی دھن میں
میں جاگتا ہوں
کئی برس سے
کہیں بھی اب وہ
بدن نہیں ہے
نہ ذہن میں ہے مٹھاس اس کی
(جنون کی چاہتیں کیا کیا)

وزیر آغا نے بجا طور پر میرا جی کی شاعری کو دھرتی پوجا کی مثال کہا تھا۔ میرا جی کی جڑیں زمین میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں، اسی لیے بقول شاہد احمد دہلوی اس کا جسم اسے اسفل السافلین کی طرف کھینچ کر لے جاتا اور روح اعلیٰ علیین کی طرف اٹھانے پر مصر تھی۔ حنیف ترین اور میرا جی کے کلام میں فکری اور فلسفیانہ سطح پر کوئی مماثلت نظر نہیں آتی، لیکن اسلوبیاتی سطح پر ایک مبہم اور دھندلی سی یگانگت کا احساس ضرور ملتا ہے۔ تلاش ذات کا پہلو دونوں شاعروں کے یہاں ایک جہد مسلسل کے استعارے کے طور پر سامنے آتا ہے اور یہی استعارہ

تلاش آدم کی دھن کو ایک جذبی کیفیت سے سرشار کرتا ہے۔ حنیف ترین کی شاعری دو ٹوک لفظوں میں ایک بے قرار روح کی پکار ہے جو کبھی صوفی کی لے سے نکلی ہوئی تان بن کر آتما میں اترتی ہے۔ کبھی بجلی کی کڑک بن کر اندھیروں کے دبیز پردوں کو چیرتی ہے اور یہی پکار کبھی کسی معصوم بچے کی سسکیوں میں ڈھل کر قاری کی روح کو تڑپاتی ہے۔ اسی وجہ سے بقول صلاح الدین پرویز، حنیف ترین کے یہاں ایک سے زیادہ اسالیب کی نشان دہی ہوتی ہے۔ حنیف ترین کے لہجے میں یک رنگی نہیں، بلکہ ایک واضح اور غیر مبہم تنوع ہے۔ میرے استنباط کے مطابق لہجے کے اسی تنوع نے اس کے اسلوب کو میکانیکی بننے سے بچایا ہے اور اس کا انداز بیان ہر سطح پر فن کارانہ جمالیات کا پاسدار بن گیا ہے۔ اس کی ہر تخلیق نظم، غزل، یا غزل نما موضوع کے ساتھ ہیئت کا ایک ابدی رشتہ لیکر منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ وہ نہ صرف زبان کے اتار چڑھاؤ سے پوری طرح واقف ہے، بلکہ بیان کی پیچیدگیوں اور اس کے موثر تقاضوں سے بھی آشنا ہے۔ عہد حاضر کے بظاہر بے جوڑ ارتباط اور تفاوت میں ایک غیر مبہم انسلاک سے اس کا ذہن مملو ہے۔ اس کی شاعری کا کینوس، تجربے کی رنگارنگی کے دوش بدوش، بے کنار وسعتوں پر پھیلا ہوا ہے۔ واقعات، کردار اور کیفیات گوناگوں رنگوں کی طرح الفاظ کا جامہ اوڑھ کر، ایسی تصویریں بناتے ہیں جن کی بوقلمونی حیرت اور استعجاب کے ہزاروں پردے گراتی اور اٹھاتی ہے۔ فلسطین، بوسنیا، شکاگو، غازہ پٹی، بیت المقدس، جمنا گھاٹ، دم توڑتی ہوئی ڈل جھیل، عرب کی ٹریفک پولس، صحرا کی شام، ابراہیم کی اولاد کے بدلے دو (میاں کٹھ) شبنم سے نازک پتیاں، دھوپ کا سائبان، امریکن لڑکی رجن وائی اوری، سنبھل گاؤں کی چوپال اور اس طرح کے ہزاروں کردار و واقعات اس کی شعری بساط کے پرے ہی نہیں بلکہ جگہ جگہ مستقل استعاروں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ وہ ہمہ وقت ایک طرح کے روحانی لینڈ اسکیپ میں سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ پھر بھی اس روحانی ماحول میں اس کی رومانیت ایک بلیغ علامت کی طرح ابھرتی ہے۔ وہ عہد حاضر کا مرثیہ خواں بھی ہے، مدح طراز بھی اور سفاک طنز نگار بھی۔ وہ دور جدید کا منظر نامہ خون دل میں ڈبوئی انگلیوں سے نہیں لکھتا بلکہ مٹی کی دوات میں تیر کا قلم ڈبو کر روشنائی سے طرح طرح کے خاکے بناتا ہے۔۔۔ اس رومانی رویے کے باوجود اس کا لہجہ کہیں کہیں تلخ اور زہریلا بھی دکھائی دیتا ہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ انسان کے حیوانی روپ کو دیکھ کر یوں سہم جاتا ہے جیسے ایک معصوم بچہ ایک چیل کو مشک بید جیسے نرم و نازک چوزے پر جھپٹتے ہوئے دیکھ کر لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ حنیف ترین انسانیت کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کا نوحہ خواں ہے۔ اس کی شاعری ایک بت کدہ صفات ہے جس کی نوائے شوق سے حریم ذات میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ وہ توحید ربانی کے علاوہ توحید انسانی کا نقیب ہے۔ ارشاد باری ہے۔ ایک بے گناہ کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے، اس آیت کی خوشبو حنیف کی فکر کا ایک مستقل حصہ بن گئی ہے جو اظہار کی سطح پر آ کر اس کے تجربات کو مختلف وشاؤں کی طرف موڑتی رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ حنیف ترین خون کے دریا پر کھڑا انسان کی وحشیانہ پیاس کے سمندر کی حدیں ماپنے میں مصروف ہے۔ حنیف کی ایک نظم ہے ''باغی سچے ہوتے ہیں'' یہ ہمارے دور کی ایک اہم شعری دستاویز ہے۔ اس نظم میں عصری حقائق کا تخلیقی سطح پر بیانیہ طرز اظہار نئی بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر مجھے کشمیر کے عہد ساز شاعر عبدالاحد آزاد کی شاہکار نظم ''دریا'' یاد آئی جو اپنی روانی اور بہاؤ کے اعتبار سے عالمی شاعری کی سطح پر رکھی جانے کے قابل ہے۔ جس طرح اس نظم کو پڑھتے ہوئے مڑ کر دیکھنے کی مہلت نہیں ملتی۔ اسی طرح حنیف ترین کی یہ نظم ''باغی سچے ہوتے ہیں'' ایک ہی نشست میں یا یوں کہئے ایک ہی سانس میں ختم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس نظم میں سہو کی ست رنگی جھنجنا اٹھتی ہے۔ جمود میں ایک ختم کے تحرک کا احساس ہوتا ہے اور غفلت میں بیداری کا طلسم جاگنے کی کیفیت فکر و احساس پر طاری ہو جاتی ہے:

اس نے وعدہ کیا تھا ملنے کا
وہ نہیں آئی کیوں نہیں آئی
اس نے وعدہ کیا تھا ملنے کا
نخل و زیتون کی بہاروں میں
غزلہ کے بحری سبزہ زاروں میں
بیٹھے خوابوں کی کشتیوں میں رواں
بحر امکاں، لطافتوں کا جہاں
ہو گئی تھی، دوئی یکجا

تھے زمان و مکاں بھی ہمسایہ
زندگی یہ حسیں نظر آتی
پیار گیتوں سے چھلکی زیبائی
فرحتوں سے جدا تھی تنہائی
اس نے وعدہ کیا تھا ملنے کا
خان یونس کے قہوہ خانے میں
سوچتا ہوں وہ جب چلی ہوگی
اس پہ بجلی ہی گر گئی ہوگی

رچل وائی اوری ایک ۲۳ سالہ امریکن Human activist تھیں جس کو صیہونی کے بلڈوزرس نے فلسطین (اسمفولہ) میں کچل کر مار دیا تھا۔ اس وقت وہ لڑکی ایک فلسطینی کا گھر مسمار ہونے سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ واقعہ ۲۷/ مارچ ۲۰۰۳ء کو اس وقت پیش آیا جب اتحادی افواج عراق کے مجبور اور مقہور عوام کو ایک غاصب حکمراں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے برسرِ پیکار تھے:

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

اس کے بعد نظم آگے بڑھتی ہے اور سوالوں پر سوال کرتی ہوئی ایک تند و تیز دریا کی طرح بہتی ہے، واقعات سطحِ آب پر خس و خاشاک کی مانند نمودار ہوتے ہیں:

ہم بھی کیا ہٹلروں کے ساتھی نہیں
اور چنگیزیوں کے بھائی نہیں
لاٹھی اور بھینس کی کہانی میں
ہم بھی کیا ننگ اتحادی نہیں
کب تلک میڈیا کی جنگوں کو
دیکھ کر فرحتیں تلاشیں گے
کن حدوں تک رہے گی خاموشی

خاموشی کی حدوں کا جواب نہیں۔ کیونکہ خاموشی جب حد سے گزر جاتی ہے تو سنگلاخ

باندھ توڑ دیتی ہے۔ خاموشی طوفان کی آمد کی دلیل کہلاتی ہے۔ دباؤ ایک خوفناک حربہ ہے جس طرح ظلم کی انتہا ظالم کو مٹا دیتی ہے، اسی طرح لب بستگی اور بستیوں کے اندر، زندہ وجودوں میں پلنے والا شہر خموشاں کا سا سکوت، بالآخر احتجاج کا لاوا بن کر پھوٹ پڑتا ہے اور ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے کر تہس نہس کر دیتا ہے۔ کن حدوں تک رہے گی خاموشی، کے بعد نظم خود کلامی کا اسلوب اپناتے ہوئے یوں آگے بڑھتی ہے:

ضعف انسان آخرش کب تک
جبر کے ہاتھ خاکداں ہوگا
ذہن انساں کی احتراموں کو
کیوں تباہی کی سمت موڑ دیا
کب تک آخر لہو کی لالی سے
نو بہ نو اسلحے بنائیں گے
اور تصویر مرگِ انساں کی
گھر کے البم میں یہ سجائیں گے
کب تلک دہشتوں کے سودائی
عام انساں پہ ظلم ڈھائیں گے
کہتے کہتے وہ اتنا اوب گئی
اپنے اشکوں کی گہری جھیلوں میں
وہ سسکتی بلکتی ڈوب گئی
میرا وعدہ تھا اس سے ملنے کا
حوصلوں کے جمے پہاڑوں پر
صبر کے بہتے آبشاروں میں
لیکن افسوس وہ نہیں آئی
اس نے وعدہ کیا تھا ملنے کا

پوری نظم ایک مکمل اعتماد اور یقین محکم سے شروع ہوتی ہے اور اسی یقین محکم پر ختم ہوجاتی

ہے۔ اس نظم کی ایک اور خوبی اس کا ظاہری ڈھانچہ یا ہیئت ہے۔ موضوع ہیئت کے ساتھ اس طرح مربوط ہے کہ اس موضوع کے لیے کسی دوسرے ڈھانچے یا Structure کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ مجھے نجانے کیوں یہ نظم پڑھ کر، Emily Dickenson کی نظمیں یاد آئیں جن کے بارے میں ایک ناقد نے کہا تھا: full bodied poems

جدلیاتی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہیں کہیں "باغی سچے ہوتے ہیں" کو خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے، لیکن اس سے نظم کی وہ پراسرار کیفیت نمایاں ہونے میں مدد نہیں ملے گی جو بیانیہ اسلوب نے پہلے ہی قاری پر منکشف کر کے رکھ دی ہے۔

یہ نظم اپنے اندر جو موضوعات سموئے ہوئے ہے۔ اس میں تصورِ حسن، جزا و سزا، شناخت، اخلاق، شہرت، موت، خوف مرگ، وجود کا زوال اور انسان کی عظمت جو اب صرف ذلت کے حوالے سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ حنیف ترین کی جمالیات بچپن کی سرحدوں کو پھلانگتی ہوئی جوانی اور پھر ادھیڑ پن میں آتے آتے، اپنی مخصوص اخلاقیات سے الگ نہیں ہو پاتی۔ حسن اور سچائی میں اس کے یہاں کوئی فرق نہیں، یہ ایک ہی سکے کے چت اور پٹ ہیں۔

اس نظم سے حنیف ترین کا یہ بنیادی فلسفہ واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی جمالیات اور فن سے الگ ہو کر فعال نہیں ہوسکتی۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ جینے کے لیے مرنا لابدی ہے۔ عرفان کی آخری منزل فنا ہے۔ وہ مشہور یونانی مقولے، conent no man beautiful till his death کے برعکس سوچتا ہے، اس لیے کہ زندگی اس کے لیے حسن کی معراج ہے۔ وہ خزاں کو بہاروں کا نوحہ خواں کہتا ہے۔ اس طرح موت کے فطری عمل کو جب ایک سفاکانہ طرز عمل کے طور پر دیکھتا ہے تو "باغی سچے ہوتے ہیں" جیسی نظم کا خالق بن جاتا ہے۔ معریٰ نے اقبال کی زبان سے کہا تھا ؎ ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔ حنیف ترین کا سوال اس سے الگ ہے، وہ ضعیف اور زبردست کی موت پر یکساں نوحہ کناں ہے۔ اس کا المیہ ہے کہ موت جیسے فطری عمل کو وحشیانہ بنانے میں مہذب ترین لوگ پیش پیش کیوں رہے ہیں۔ یہ کہانی روم، مصر، غرناطہ، دلی، غرض، نجانے کب سے زمین اور اس کے رہنے والوں کو لاپتہ بناتی رہی ہے۔ ۱۶ویں صدی میں شاید حاتم کو اسی لیے کہنا پڑا تھا:

حنیف ترین

کیا زمانے کی ہوا ہوگئی سبحان اللہ
زندگانی ہوئی ہر ایک کی اب دشمن جاں

بین الاقوامی سماجیات کو ایک انسانی رویے کے طور پر برتنے اور سمجھنے کے لیے جو باریک بینی حنیف ترین کے یہاں ملتی ہے، وہ اس کے فن پاروں کو حیات آمیز ہی نہیں بلکہ حیات آموز بھی بنا دیتی ہے۔ وہ مقتول کی تڑپ ہی نہیں، بلکہ قاتل کے کرب کو بھی اپنی گرفت میں لاتا ہے اور پوری فن کارانہ دیانت داری اور چابکدستی کے ساتھ — شمس الرحمٰن فاروقی نے حنیف ترین کی کتاب ''زمین لاپتہ رہی'' کے دیباچہ میں بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''... دنیا خود ہی بڑی ظالم اور پراسرار اور اجنبی قوت ہے اور شاعر کی حسیت کو وہ عام طور پر ناپسند کرتی ہے۔ اب رہے لفظ، بظاہر لفظ دنیا کی طرح ظالم پراسرار اور اجنبی نہیں ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت کو وہی جانتا ہے جو انہیں قابو میں لانے اور برتنے کی کوشش کرے، تب شاعر کو معلوم ہوتا ہے کہ لفظ تو دنیا سے بھی اجنبی ہیں...''

حنیف ترین انہی خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جو اپنی شاعری میں دنیا کی پیچیدگی، گہرائی، اجنبیت، ظلم و ستم، جبر دت و انبساط کو الفاظ کے ذریعے کاغذ پر لے آتے ہیں۔ لفظ اب ان کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حنیف ترین کی شاعری ماضی اور حال کے درمیان ایک تسلسل کا کام کرتی ہے:

پانی نے جسے دھوپ کی مٹی سے بنایا
وہ واتیرہ ربط بگڑنے کے لیے تھا

O

سنگ بھی پھینکتا رہتا ہے کبھی ساحل سے
اور پانی میں بھی ہلچل نہیں ہونے دیتا

O

جن کا یقین، راہ سکوں کی اساس ہے
وہ بھی گمانِ دشت میں مجھ کو پھنسنے لگے

O

رنگوں میں سفیدی کا اثر پھیل رہا ہے
کیا شاخ شجر پر کوئی پتھر نہیں آیا

O

صحرا کی بشارت پہ شاہین کے ڈر سے
باغوں میں زمانوں سے کبوتر نہیں آیا

O

ڈاکٹر حامدی کشمیری نے حنیف کی شاعری کا ان موزوں الفاظ میں تجزیہ کیا ہے:
''حنیف ترین ایک بالغ نظر انسان کی طرح ملکی اور عالمی سطح پر زندگی اور اخلاق کی ذی احترام قدروں کی پامالی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پراگندگی اور تباہی پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس غیرانسانی عورت کے محرکات اور عوامل سے صرف نظر کر کے ایک سادہ اور رومان پسند اور خواب بین انسان کی طرح آدرشوں کی شکست کی المنا کی کو محسوس کرتے ہیں:

موت جب بھی ہو گوش برآواز
داستانِ حیات مت چھیڑو
ہوگئی ہے اک اک خوشی معدوم
غم میں ڈوبی ہے ذات مت چھیڑو

حنیف ان منہ بسورے روز و شب کے
جواں پرندوں پہ کیوں شرمندگی ہے

اور پھر یہ شعر حنیف کی تجربہ پسند اور کس قدر خطر پسند طبیعت پر صادق آتا ہے:

میری تخلیق وجہ ارتقائے فن رہی ہے
لکیروں کے فقیروں سا سخنور میں نہیں ہوتی

زاہدہ زیدی نے عصری غزل کا منظرنامہ کے عنوان سے ایک مضمون میں، غزل کے لہجے رچاؤ اور بچھاؤ کا ایک مدلل تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ حالیہ غزل نے اپنے

آپ کو ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے اثرات سے آزاد کردیا ہے— وہ نہ تو فارسی لفظیات کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ روایت کی آہنی پاسداری کہ انداز بیان پامال نظر آئے بلکہ ایک والہانہ اظہار کی متلاشی ہے (خیالات زاہدہ زیدی کے ہیں الفاظ میرے ہیں) اس سے مراد، روایت سے انحراف نہیں بلکہ ایک طرح کا سمجھوتہ بھی ہے، جس سے صحت مند تجربوں کی راہیں ہموار ہوجاتی ہیں۔

حنیف ترین کی شاعری زمان و مکان کی حدبندیوں سے بے نیاز ہے، اس لیے اس میں جینون شاعری کی تمام تر خصوصیتیں موجود ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اسالیب اور انداز بیان ہر دور میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں اس لیے ناگزیر ہیں کہ زبان ایک ہی ڈگر پر نہیں رہتی۔ لفظیات تہذیبی، ارتقاء کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر ہوتی ہے۔ بعینہٖ اظہار میں بھی ارتقاء ایک تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور مختلف تجربات ایک مشاق فن کار کو نئے سانچے اور نئی ہیئتیں اپنانے پر مجبور کرتے ہیں۔ حنیف ترین کی ''کشت غزل نما'' ان کی اسی تجربہ پسند طبیعت کی آئینہ دار ہے۔ اس مجموعے میں غزل نما کا tormat استادانہ شان اور فن کارانہ طرح داری سے آزمایا گیا ہے۔ بعض اوقات ہیت کے نئے تجربے مواد کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو پاتے۔

متن درہم برہم ہوجاتا ہے اور لفظوں کے بھنڈار کی صورت میں ایک چیستان وجود میں آتا ہے؟ جب کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا۔ حنیف ترین کی ہر تخلیق full bofies مجرد نہیں بلکہ مجسم پیکر بن کر سامنے آتی ہے۔ غزل نما کی بیشتر تخلیقات اپنی جدید تر ہیت کے باوجود، غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ کیونکہ ہر شعر ایک مکمل مضمون بن کر سامنے آتے ہوئے بھی پوری تخلیق کا ایک اندرونی تسلسل قائم رکھے ہوئے ہے۔ ملاحظہ ہو:

سنبھلنے میں جو گرتا ہوں تو گر کر پھر سنبھلتا ہوں
یونہی میں زندگی میں ٹیڑھی میڑھی راہ چلتا ہوں
میری پہچان مشکل ہے
میں روز و شب بدلتا ہوں
مجھے تاریکیوں کا گھر نہ کہہ دینا

میں سورج کی طرح چھپ کر نکلتا ہوں

○

وادیٔ کشمیر جب سے جسم و جاں بنی
مجھ کو صحرا کی تپش میں بھی بڑا آرام ہے
دل کے کتبے پر مرے
نقش تیرا نام ہے

ذیل کے غزل نما کے لہجے کے دھیمے پن کو ملاحظہ کیجئے:

اشک شعلہ بنا، تتلیاں جل گئیں
ساعتیں جب غم ہجر میں ڈھل گئیں
ہکا بکا رہی زندگی
گردش جاں میں جل گئیں
تال سر جب ملے
وحشتیں ٹل گئیں
کچی کچنار سی خواہشیں
مونگ سینے پہ کیوں دل گئیں

بیسویں صدی ہر اعتبار سے نئے فکری، سائنسی، سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کی صدی ہے۔ یہ صدی نئے رجحانات اور تازہ تر خیالات اور عقائد کی صدی بھی کہلاتی ہے۔ ہر وہ دور جس میں سماجی ارتقاء تیزی سے ہوتا ہے، اپنے دامن میں نئی نئی اصطلاحوں کو بھی بھر دیتا ہے۔ اِسی صدی میں Citizen of the world کی اصطلاح بھی وجود میں آئی، جو اپنے کثرت استعمال کے باوجود فرسودہ نہ ہوتے ہوئے بھی بے معنی بن گئی ہے۔ ابلاغ کے عالمی رابطے نے گلوبل ولیج تو قائم کیا، لیکن انسان کو اپنی جنم بھومی سے رشتہ توڑنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ انسان بھلے ہی اپنے آپ کو تمام عالم سے منسوب کرتا پھرے، لیکن وطن عزیز کی مٹی

کی جو خوشبو اس کے وجود میں رچ بس گئی ہے، وہی خوشبو اس کی اصلی پہچان یا شناخت بن جاتی ہے۔ وہ اس گوٹ یا گاؤں کو بھول نہیں پاتا، جہاں اس نے 'ندی کنارے' پیڑوں کی نرم چھاؤں میں، یا چوپال کے آس پاس مٹی کے گھروندے بنائے ہوں — دراصل وطن سے محبت کا تصور اتنی ہی قدیم ہے، جتنی قدیم انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ ہے۔ رنگ، نسل اور علاقہ گو کہ کم تری اور برتری کا تعین نہیں کرتا، مگر پہچان بہر حال قبیلوں کے ہی حوالے سے ہوتی ہے۔ گذشتہ صدی نے غریب الوطنی، حب الوطنی، ہجرت، بن باس اور نقل مکانی جیسی اصطلاحوں کو ایک نئی معنویت عطا کی ہے جو بسا اوقات ان اصطلاحوں کی لایعنیت بن جاتی ہے۔

حنیف ترین وطن سے دور اپنے وطن سے قریب ترین تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنی جنم بھومی کی مٹی سے جڑا ہوا ہے۔ وہ ارار کے ریگستانوں میں سنبھل کے چھوٹے سے گاؤں کو سراب کی طرح دیکھتا ہے۔ اس کا دردن آج بھی برسات میں بھیگتا ہے اور ظاہر میں ارار کی دھوپ کا سائباں تانے حالات کی تپش اور جہد مسلسل کی تمازت سے نبرد آزما ہے۔ اس کے یہاں طبیعت اور حب الوطنی کا یہ ملا جلا احساس، ایک نئی شعری فضا کو بنانے میں کافی مددگار ثابت ہوا ہے۔ حنیف ترین کے کلام میں چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد یہ فضا جاگتی ہے، پھر غائب ہوتی ہے اور اس طرح تبدیلی کے عمل میں ہزاروں آئینہ خانوں پر چھا جاتی ہے۔ جہاں Images یا پیکروں کا ہجوم ہے — یہی پیکر شعری تجربے میں ڈھل کر تخلیقی عمل میں تحلیل ہوتے ہیں اور کبھی غیر مرئی اور کبھی مجسم صورت اختیار کرتے ہیں۔

حنیف ترین کی نظموں میں nastalgia عام ڈگر سے ہٹ کر دکھائی دیتا ہے۔ ہجرتیں بےدال بن جاتی ہیں، وجہ ملال بن جاتی ہیں اور بالآخر گردش ماہ و سال میں م.جبر ایام بن جاتی ہیں۔ مجھ سے ایک مجذوب نے ایک بار کہا تھا، جو برسوں میں زندہ رہتا ہے، وہ مہینوں کو کھو دیتا ہے، جو مہینوں میں زندہ رہتا ہے، وہ ہفتوں کا زیاں کرتا ہے، جو ہفتوں میں زندگی گزارتا ہے، وہ دنوں کا نقصان اٹھاتا ہے اور جو دنوں میں وقت کاٹتا ہے، وہ گھڑیاں، لمحے، پل چھن، غرض وقت کے آخری سب سے چھوٹے پیمانے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ہجرتوں کے ایام کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اقبال نے شاید اسی لیے کہا تھا:

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ماپ
زندگی پیہم رواں ہر دم جوالا ہے زندگی

حنیف ترین کی نظم ''ایک خیال آتا ہے'' پڑھنے کے بعد قاری کو بہت دیر تک اسی طرح کی کیفیت عطا کرتی ہے۔ یہ نظم زندگی کی Synamies سے زیادہ قریب ہے اور کنفیوش کے فلسفے کے نزدیک دکھائی دیتی ہے۔ اس میں ریتیں بدلتی ہیں۔ بادل اڑتے اڑتے پانی برسانے لگتے ہیں۔ پھر باڑھ آجاتی ہے اور ہر شے کو بہا لے جاتی ہے۔ زمین لاپتہ ہوتی ہے — سوکھا پڑتا ہے تو بنجر زمین پر جانوروں اور انسانوں کے انجر پنجر حد نظر تک دکھائی دیتے ہیں۔ بھوک جو بڑی ہم خوابہ ہے، نا قابل برداشت ہم سفر بن جاتی ہے۔ لیکن وقت پھر کروٹ بدلتا ہے۔ خوشگوار ہوائیں روح میں تازگی بھرتی ہیں اور جسم ایک بار پھر ڈھول کی تھاپ پر رقص کرنے لگتے ہیں۔ نظم اسی کرب و انبساط، فریب و التباس اور بیم و رجا کی معرکہ آرائیوں سے گزر کر بعد تمکنت آگے بڑھتی ہے۔ ایک خیال آتا ہے:

گھر سے دوریوں کا غم
آنسوؤں کے صحرا میں
پھول سے کھلاتا ہے
میری پیاری بیٹی ہے
راگنی ہے الفت کی
جو گلوں کے ہونٹوں پر
خوشنما کہانی ہے
اک رباب الفت ہے
چشم و دل کی جنت ہے
یاد آرہے ہیں پھر
مجھ کو میرے دو پانکھ
یعنی حماد اور یاسر

کشمیر کے ساتھ حنیف ترین کو خاص نسبت ہے۔ یہیں پر انہوں نے میڈیکل کالج میں

تعلیم پائی۔ یہیں پر ڈاکٹر شمیم اختر کی صورت میں شریکِ حیات میسر ہوئی—''ایک خیال آراء حنیف ترین کا ذہنی سفرنامہ ہے۔ اس میں بچپن، لڑکپن، جوانی، سفرِحضر، زور، زر، زمین، یہ سب علامتیں پوری توانائی کے ساتھ شعری پیکروں میں ڈھل گئی ہیں۔ اس نظم میں وقت مختلف خانوں میں بٹتا نہیں ہے بلکہ اقبال کے اس مصرعے کے مصداق:

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک— ایک نئے انداز اور اسلوب سے مضامین نو کے انبار لگاتا ہوا شاعر آگے کی طرف مستعدی سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

''کشت غزل نما''، ''کتاب صحرا'' اور ''زمین لاپتہ رہی'' وغیرہ میں جو جو مشمولات ہیں ان کے بارے میں وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ حنیف ترین کا جہانِ معنی منفرد ہے۔ اس کا لسانی نظم اس کی شاعرانہ شناخت کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے۔ میں احمد ندیم قاسمی کی ناقدانہ رائے کو اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہوں:

> ''حنیف ترین کی شاعری نیچر اور انسانی زندگی کے ازلی و ابدی ارتباط و امتزاج کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ ان کی نظم اور غزل میں کم ہی ایسے مقامات وارد ہوتے ہیں جو اس کیفیت سے محروم ہوں۔ ورنہ ان کی تمام شاعری آسمان، زمین، فطرت اور انسان، ماورائیت اور حقیقت کے ملاپ کی نمائندہ ہے۔''

ان الفاظ کے ساتھ میں حنیف ترین کے یہ اشعار آپ کی نذر کرتا ہوں:

زخم ہرا جب ہووے گا کل پرسوں میں
سارا عالم چہکے گا کل پرسوں میں
خواب کا خیمہ نور کی چادر سے ڈھک کر
پر بنجارہ چل دے گا کل پرسوں میں
خوش اوقات سنہری رت میں آجانا
اجڑا موسم سنبھلے گا کل پرسوں میں
چھاؤں پہ قابض ہر محرا نے کید و حنیف
یہ ذرہ بھی چمکے گا کل پرسوں میں

✪✪✪

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

حنیف ترین کی نظموں میں فکر انگیز پہلو

فنکار کا دماغ ایک Catalyst کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں دو قسم کے تجربات واحساسات اور جذبات جمع ہو کر آپس میں ضم ہوتے رہتے ہیں اور کُل کی صورت اختیار کرتے ہیں اس طرح احساسات ان تجربات کے ہم معنی ہیں جو کچھ مبہم اور نا قابل فہم ہیں اور جذبات کا مفہوم اپنے تجربات سے ہے، جو زیادہ واضح، غیر مبہم اور ادراک پذیر ہیں۔

حنیف ترین نئے جذبات اور نئے تجربات کی ہی تلاش نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنی نظموں میں عام روزمرہ کے واقعات اور مشاہدات کو مصرف میں لاکر ان میں نیا جذبی اور تصوراتی پہلو پیدا کرتے ہیں۔ غیر مرئی، دھندلے اور نا قابل فہم احساسات کو لطیف فنی سانچے میں ڈھال کر انہیں صاف، ترتیب وار اور قابل فہم بناتے ہیں اور جذبات کی سطح تک اس طرح لاتے ہیں کہ توازن، رکھ رکھاؤ، شائستگی اور شرافت کے انداز بدل جاتے ہیں اور جزئیات اور مشاہدات میں تیزی اور گہرائی نظر آنے لگتی ہے۔

حنیف ترین کی نظموں میں جو تخلیقیت شناسی ہے اس کا صحیح شعور زندگی کو قریب سے دیکھنے اور اپنے محسوسات قاری تک پہونچانے میں بڑی مدد دیتا ہے، جس سے قاری کے نقطۂ نظر میں وسعت، لچک اور پُر امیدی پیدا ہو جاتی ہے۔

کسی معاشرے کی اجتماعی اور انفرادی تعمیر میں اس کے ادب کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور ادب کے مجموعی ذہن کی صحت مندی قائم رکھنے کے لیے نظمیہ شاعری کا وجود ناگزیر ہے اس طرح بالواسطہ یہ قاری کی ذہنی تعمیر میں مدد دیتی ہے تو دوسری طرف ادب کے وقار کا بھی تحفظ کرتی ہے۔

شکست خوردگی کے ساتھ اکثر افراد یا طبقوں میں جو ذہنی پستی پیدا ہوتی ہے وہ بعض

قوموں کے ادب کو ایک خاص دور میں ابتذال، سوقیت اور طعن و تشنیع کی خطرناک راہوں پر ڈال دیتی ہے۔ ایسے دور میں تمدن اور ثقافت کی صحیح اور غلط قدروں میں امتیاز کرنا دشوار ہوتا ہی ہے لیکن ان کو ایک دوسرے سے ممتاز و محفوظ رکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ادب کے مجموعی ذہن کا توازن قائم رکھنے کے لیے حنیف ترین جیسے نفسیات کے ماہر سامنے آتے ہیں اور اپنی تخلیقی اپج سے ادب کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

حنیف ترین اپنی نظمیہ شاعری میں زندگی کا تازہ خون دوڑاتے ہیں، اور زندگی کی ان گنت کشمکش، الجھن اور پریشانی کو مسکراہٹ اور چبھن کی قندیل سے روشن کرتے ہیں۔

نفرت جو بڑھی خون کے طوفان اٹھیں گے
بازاروں میں گلیاروں میں بم روز پھٹیں گے
پل پلیاں ہی کیا، ڈیم تلک ٹوٹ بہیں گے
یہ شہر یہ دیہات نہ آباد رہیں گے
بھر جائے گی بارود کی بوساری فضا میں
گھٹ جائے گا دم زہر سی آلود ہوا میں (۶/دسمبر ۱۹۹۲ء)

سانحہ بابری مسجد کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر جو ننگا ناچ ہوا، حیوانیت کی جو تصویریں لوگوں نے دیکھیں، دھماکوں اور چیخ و پکار کے درمیان جنھوں نے اپنے رات دن گذارے، قتل، آگ زنی، اور لوٹ کھسوٹ کا جو ماحول گرم ہوا، اس سے ایک عام آدمی بھی دل گداختہ جن احساسات سے گذرا اس کی نقشہ کشی حنیف ترین نے بھی کی ہے۔ سات بند کی یہ نظم ایک الگ ماحول میں لے جاتی ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ حنیف ترین کی ایک اور نظم ''سوچ'' ہے، جس میں سوچ کے کئی زاویے بیان ہوئے ہیں:

لہو تیرا پیے گی
سفیدی سر کو اک دن بخش دے گی
پسینہ بن کے ماتھے پر اگے گی
تجھے کہہ کہہ کر ہنسے گی
یہ آنکھوں کی نمی پیکر بڑھے گی
ارادوں میں پلے گی

تری آنکھوں سے نیندیں چھین لے گی
جلن پلکوں کو دے گی
کبھی محفل میں تنہا چھوڑ دے گی
کبھی اک بوجھ خود تجھ پر بنے گی
یونہی تا عمر تیرے ساتھ ہنس ہنس کر چلے گی
تو گونگی سوچ یہ کندن بنے گی
حیاتِ نو کے ہر اک زاویے کو
کسی دن خود یہی روشن کرے گی

زندگی کو جینے کا طریقہ ہر کسی کے لیے الگ الگ ہوتا ہے اسے بھوگنے اور برتنے کا انداز سب کا جداگانہ ہوتا ہے۔ حنیف ترین نے ملک اور بیرون ملک گھوم کر زندگی کو دیکھا پرکھا ہے ان کے محسوسات اسی لیے منفرد ہیں:

کیونکہ اب مشینیں بولتی ہیں
جھوٹ و سچ بھی تولتی ہیں
جسم و جاں کی نیلی، پیلی وارداتیں جان لیتی ہیں۔

(کمپیوٹر کی لال بتی جل گئی ہے)

مشینی زندگی ایک ایسا آراستہ مکان ہے جو دور سے عالیشان تہذیب کی نشاندہی کرتا ہے لیکن اندر داخل ہوتے ہی دراڑیں پڑی دیواریں، کھنڈرات اور تہذیب کے شیرازے بکھرے ہوئے ملتے ہیں:

مرے کانوں میں مشینی شور بھر کر رہ گیا ہے
مرا پیچھا یہاں رفتار سے ہے
ایٹامک دور ہے ہر چیز نے رنگت بدل لی ہے
پرانے قافیوں کی تختیوں سے کون اب الجھے
مجھے لکھنی ہیں روودادیں
اپنی شکستوں کی
جوانی کے حسین ان اتفاقوں کی

جنھوں نے خون رلوایا

(وارفتگی روشن احساس کی)

یوگوسلاویہ کے خاتمے کے بعد قلب یوروپ میں بوسینا ہرزیگووینا نام کی ایک مسلم مملکت وجود میں آئی تھی۔ اس وقت شاید کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے وجود کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے پڑوسی دشمنوں کی یلغار کا اس جانبازی سے اور جاں سپاری کے ساتھ مقابلہ کرے گی اور ہمت مردانہ اس وقت تک جاری رکھے گی جب تک اس کے اوپر منڈلاتا ہوا خطرہ دور نہیں ہو جاتا۔ بوسنیا پر یوروپ اور امریکہ کی مدد سے مسلسل سرب اور کروٹ حملوں کا سلسلہ جاری ہے اور لاکھوں لاکھ افراد شہید اور بے وطن ہو کر دوسرے ملکوں میں کس مپرسی کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں ایک ایسی کربناک صورتِ حال سے یہ قوم دوچار ہے جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ یہ بوسنیائی مسلمان جہاں ایک طرف عالمی اداروں اقوام متحدہ، سلامتی کونسل، ناوابستہ تحریک اور دوسری بین الاقوامی تنظیموں کی سرد مہری کا شکار ہیں وہیں وہ عالم اسلام اور مسلم تنظیموں عرب لیگ، اسلامی کانفرنس جیسے اداروں کی خاموشی کا بھی شکار ہیں۔ بوسنیا کی وادیوں، شہروں، قصبوں اور دیہات میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح اس لیے بہہ رہا ہے کہ وہ سفید فام تہذیب وتمدن کے ٹھیکیداروں اور سیکولرزم اور لادینیت کے علمبرداروں کی طرح تثلیث پرست نہیں ہیں بلکہ خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان رکھتے ہیں ان کی حالتِ زار سے پوری دنیا متاثر ہے اور حساس آدمی ان کی داستانیں سن کر اور پڑھ کر خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

زندگی کو مت چھیڑو
یہ ہے چھپی ناگن
دیکھنے میں پیاری ہے
کاٹنے کی عادی ہے
کربِ جاں بڑھاتی ہے
اور ہمیشہ ماضی کے
نوحے گنگناتی ہے

(زہریلی ناگن)

دنیا دیکھنے کا جو تجربہ حنیف ترین کو ہے ویسے مواقع بہتوں کے حصے میں نہیں آتے، اچھائی اور برائی دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد دنیا کی بے ثباتی کو انھوں نے کچھ اس طرح اجاگر کیا ہے:

اور لوگ یہاں ہیں ایسے بھی
جن کی فکریں اور تخلیقیں
سرتاسر بارود بھری ہیں
بالکل ایٹم بم جیسی ہیں
اک روز جو پھٹ ہی جائے گا
رنگیں دنیا، شعلوں میں فنا ہو جائے گی

(بچے باقی رہ جاتے ہیں)

بعض اوقات سائنس کو تہذیب کا حریف سمجھا جاتا ہے اکثر سائنس کا مطالعہ ایسے طریقوں سے کیا جاتا ہے جن کو تہذیبی کہنا دشوار ہے۔ یہی حال ادب کے مطالعہ کا بھی ہے۔ لیکن شاید سائنس کو اس کے عمدہ تر مقاصد سے ہٹا دینا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ خاص طور پر یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب سائنس کے موضوع بحث کو مخصوص حقائق کا مجموعہ یا محض تکنیکی استعمال کا ایک ذریعہ سمجھا جائے، لیکن اس کی تہذیبی اہمیت نہ پہچانے جانے کی ایک بڑی وجہ سائنس کی اصطلاح کا محدود طرزِ استعمال ہے۔ سائنسی مطالعہ کسی مخصوص شعبے میں صحیح اور منظم طریقے پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ اسی کوشش کی ایک شکل مشینیں ہیں اور جدید ایجاد کمپیوٹر ہے۔ مشینوں نے ایٹم کو جنم دیا ہے اور چاند تاروں پر انسان کو کمندیں ڈالنے میں مدد دی ہے۔ لیکن اس کا دوسرا رخ بھی ہے جس کی طرف حنیف ترین نے واضح اشارے کئے ہیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے
مشینیں ایڈس کی بیماری بن کر
آج کے انساں میں داخل ہو گئی ہیں
نشیلی گولیوں کی شکل میں تبدیل ہو کر
آدمی میں پل رہی ہیں

اوران سے
آدمی اب ڈر رہا ہے

موجودہ اقدارِ زندگی میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ آسائش کے بڑے بڑے نئے نئے سامان اور ذرائع وجود میں آچکے ہیں، بجلی اور جوہری توانائی کی مدد سے مشینیں ہزاروں انسانوں کے بدلے کام کر رہی ہیں، بازاروں میں پارکوں میں کھیل کے میدانوں میں تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے، ہر طرف شور ہے ہر سو ہنگامہ ہے، ایسی حالت بڑے شہروں میں زیادہ ہے، آدمی مشینیں بن کر رہ گیا ہے سکون اور شانتی مفقود ہے، معاش اور معاشرت کا مسئلہ بڑھا ہوا ہے۔ فرصت کے اوقات مل بیٹھنے کے لمحات مختصر ہو چکے ہیں، خارجی حسن و آرائش کے لیے دولت زیادہ صرف ہو رہی ہے۔ داخل کی دنیا ویران پڑی ہے، انا، خودداری، حمیت مٹ رہی ہے، آدمی کا آدمی پر سے اعتماد اٹھ رہا ہے، خودغرضی اور خود پرستی بڑھ گئی ہے، عفت و عصمت بھرے بازاروں میں فروخت ہو رہی ہے، اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو آج کی زندگی کے شیرازے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ایسے میں حنیف ترین نے بھوک کی شدت کو تلخی سے محسوس کیا ہے اور اقدار زندگی کا تانہ بانہ اسی کے گرد بُنا ہے:

تم جھوٹے ہو
کیا کھاتے ہو جھوٹی قسمیں
کیوں چھلکاتے ہو آنکھ سے آنسو
میرے غم میں مجھ کو تسلی
آخر کب تک دے پاؤ گے
مان لیا تم میرے ہو
میری محبت تم کو ملے گی
میں بھوکا ہوں
تم بھوکے ہو
جیتے جی سب ہی بھوکے ہیں
روٹی کپڑا، چینی آٹا
گوشت مسالہ سگریٹ چائے

اور نہ جانے کتنی اشیاء
بھوک سمیٹے اپنے جسم و جاں میں
اس دھرتی پر
دور خلاء میں
غور سے دیکھو گے تو، تم کو نظر آ جائیں ایسے انسان

حنیف ترین نے بوسنیا پر ظلم و جبر کو شدت سے محسوس کیا ہے:

یہ کیسے لوگ ہیں کہ جو
چبا چبا کے گھاس کو
بھلا کے بھوک پیاس کو
سمیٹے درد و یاس کو
اٹھائے اپنے ہاتھ میں، خود اپنی اپنی لاش کو
لگے ہیں کوششوں میں اس میں پھر سے سانسیں ڈال دیں
تھکی زمیں پہ حق کا کوئی کہکشاں اجال دیں
مدافعت کی ڈھال کو نئے سروں کی تال دیں

بوسنیا کے ان بے قصور مسلمانوں کی حالتِ زار کا حنیف ترین نے بہت خوب نقشہ یوں کھینچا ہے:

لٹی ہیں جن کی عصمتیں وہ روحیں بلبلاتی ہیں
پچک گئے جو بھوک سے وہ پیٹ تلملاتے ہیں
بلا کی ٹھنڈ سے جہاں پہ گرم سانسیں جم گئیں
جوان بوڑھی نبضیں بے علاج و بے دوا جہاں
پھڑک پھڑک کے تھم گئیں
جہاں پہ ہجرتوں میں کتنی بستیاں اجڑ گئیں

لیکن ان سب کے باوجود وحشی سربوں سے بغیر بڑے ہتھیاروں کے مقابلہ کرتے رہنے کی بوسنیائی مسلمانوں کی ہمت و جرأت کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس لیے حنیف ترین بھی پر امید ہیں:

یہ سرفروش و سربلند
یہ دینِ حق کے کاربند

شجیع نڈر روار جمند
بھر کے ایک ہی زقند
سارے دشمنانِ دیں کے ایک ایک وجود کو
ملا کے خاک میں سکوں کا سانس لے سکیں گے یہ

(ایک صلیبی جنگ بوسنیا)

کڑوا تیکھا سچ تو یہی ہے
سب بھوکے ہیں
چاند، زمیں، سورج، تارے سب
اک بندھن سے بندھے ہوئے ہیں
لیکن.................
میں بھوکا ہوں............تم بھوکے ہو۔ جو زندہ ہے وہ بھوکا ہے۔ چار دنوں کی اس دنیا میں۔

حنیف ترین کا شاعرانہ ذہن ایک منفرد بصیرت وصلاحیت کا مظہر ہے، انھوں نے بہت سارے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں اور ازلی الم انگیزیوں کو انوکھا ذریعہ اظہار کیا ہے:

راتوں میں ہم کب سوتے ہیں
کس کا لہجہ، کس کی باتیں
بیج کی صورت ہم بوتے ہیں
دل کے بنجر صحراؤں میں
کس کے دم سے ہے ہریالی
کون ہمارے سارے بدن سے
روز ہی لپٹا رہتا ہے
وہ کوئی اپنا ہے
یا بس اک سپنا ہے

حنیف ترین کی نظموں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ حالات، مشاہدات اور تجربات نے اُن کے کینوس کو تلخیوں کے ہمراہ وسعت دی ہے، اور زبان و بیان پیرایہ اور اظہار و ذریعۂ اظہار کی

ہم آہنگی لطافت وحلاوت بھی ان کی نظموں کی انفرادیت میں شامل ہے۔ ان کی نظموں میں بیانیہ معنویت کے تہہ نشیں افکار وخیالات کے سوز وگداز کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کے یہاں احتجاج کا رنگ وآہنگ نہیں ملتا بلکہ شکست وہزیمت کی غم انگیز لے ملتی ہے جو نہایت شفاف اور فکر انگیز پہلو رکھتی ہے۔

اسلم حنیف

ڈاکٹر حنیف ترین ــــ اکیسویں صدی کا شاعر

ڈاکٹر حنیف ترین کے تازہ ترین شعری مجموعہ "ابابیلیں نہیں آئیں" کو سمجھنے کے لیے فلسطین، افغانستان، عراق اور مغربی ایشیا کے حالات کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ یہ مجموعہ "فلسطین" اور "عراق" پر جابرانہ اور وحشیانہ طرز عمل کے خلاف ایک احتجاجی آواز ہے، ایسی آواز جو طاقت کی مرعوبیت سے آزاد ہے اور ادبی سطح پر ظلم واستبداد کے عمل اور ردعمل کی مظہر بھی۔

حنیف ترین کا یہ شعری مجموعہ "رشل دائی کوری" کے نام معنون ہے جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر اس شخصیت کے کردار کی عظمت ہی سے متاثر نہیں بلکہ اس پیکر انسانیت کے جذبۂ ایثار و جانبازی کو روح کی گہرائیوں میں اتار چکا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف وہ اپنے طویل بیانیہ موشح میں اس طرح کرتا ہے:

اس نے وعدہ کیا تھا ملنے کا
کفر دارِوم، کے گلابوں میں
غزہ کے بحری سبزہ زاروں میں
کل جہاں "رشل دائی کوری" نے
بڑھ کے بلڈوزروں کو روکا تھا
منہ پہ صیہونیوں کے تھوکا تھا
حق کی خاطر گنوا کے جان اپنی
لاج انسانیت کی رکھ لی تھی
جس کا ایثار، ظلمت شب میں
ٹوٹے تاروں کی روشنی ہے ہنوز

کل کو جو آفتابِ نو بن کر
زندگی کی ضیا بکھیرے گا

کیوں اس انسانیت کی دیوی کا
اس مغرب کو اعتراف نہیں
اپنے کلچر کو جو زمانے میں
سب سے افضل قرار دیتا ہے

لیکن اس "رشل وائی کوری" کو
جس نے حق کے لیے گنوا کر جاں
امن عالم کے خیر خواہوں کو
زندہ رہنے کا فن سکھایا ہے
ایک حساس شاعر مشرق
پیش اپنا سلام کرتا ہے
نام پر اس کی شاعری اپنی
فخر سے انتساب کرتا ہے

یہ مجموعہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ "باب فلسطین" میں فلسطین سے متعلق موشحات اور کچھ غزلیں شامل ہیں اسی طرح "باب العراق" میں عراق کے حوالے سے موشحات اور غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ تیسرے باب یعنی "شاعری حسن ہے خیالوں کا" میں جو منظوم اور غزلیہ شاعری شامل ہے وہ کسی خاص موضوع سے تعلق نہیں رکھتی۔

ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنے ایک آزاد موشح "نظر جانب آسماں کب تلک" میں مسلمانوں کی بے حسی، عہدوں کے لالچ کی بے ضمیری اور مغرب کی شاطرانہ چالوں کی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہے۔

ابابیلیں قیادت کی انا کو
.....کرسیوں کی کابکوں میں
.....قید کب کا کر چکی ہیں
فضاؤں میں ہماری زرد مایوسی

صدی پھر سے پریشاں اڑ رہی ہے
......اور ہم دنیا کے منظر میں
خود اپنے والیوں کے ......پالتو بے حس کبوتر ہیں
یہ جب بھی چاہتے ہیں
......اپنے جالوں میں پھنسا کر
......بائیں بازو کی نرالی......یا نئی نسلوں کے پنجوں
......اور فلک رفتار جستوں سے
نشانوں کو جھپٹنے کا صلیبی تجربہ کر کے
ہمارا خون پی کر، گوشت کھاتے ہیں

قرآن حکیم میں حبشہ کے بادشاہ کے گورنر ابرہۃ الاشرم کے خانۂ کعبہ کو مسمار کرنے کا اشارہ سورۂ فیل میں کیا گیا ہے کہ "ہم نے ہاتھیوں کے لشکر والوں کو (جو خانۂ کعبہ کو ڈھانے کے لیے چڑھے تھے) پرندوں کے غولوں کے ذریعے کنکریوں کی بارش سے تباہ کر دیا۔" حنیف ترین کے یہاں "ابابیل" کا استعارہ اسی سورۃ سے ماخوذ ہے۔ اردو والے ابابیل کا لفظ مخصوص چڑیا کے لیے استعمال کرتے ہیں مگر حنیف کے یہاں یہ لفظ "غیبی مدد" کے بلیغ استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے جو بغیر حرکت و عمل کے ممکن نہیں۔ مثلاً مذکورہ موشح کا یہ حصہ:

ابابیلوں کی چاہت ہے تو اٹھو!
اسی ساعت
اسی ایقان کی مانند عہد آہنی کر لو
تمہاری جس نے کل دنیا سنواری تھی
اٹھو! جاگو!
ابابیلیں تمہیں فتح و ظفر کا راستہ پھر سے بجھاتی ہیں
اٹھو! پھر آگ اور پانی سے کھیلو!

اور اس کے ساتھ غزل کا یہ شعر بھی اسی نقطۂ نظر کا غماز ہے۔

پھر ابابیلیں اترتیں غیب سے
ہوتا گر صالح عمل فریاد میں

قطع نظر اس کے مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی بربادی، پستی میں مغربی طاقتوں سے مرعوبیت، انہیں اپنا رہنما، آقا اور سرپرست تصور کرنا، حق پرستی کے راستوں سے فراریت، دھوکہ اور مکر و فریب کے عناصر کو خود میں جذب کر لینا، اقتدار کے لیے خدا اور رسول کے قوانین کو بالائے طاق رکھ دینا وغیرہ وغیرہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں ان کا ایک خوبصورت اور مختصر موشح "میرے اللہ میاں" کا مطالعہ خصوصی اہمیت رکھتا ہے:۔

ہوں ثوابوں عذابوں کے اب درمیاں
میں پرستارِ حق، نورِ ایمان کا پاسباں
کیوں نبرد آزما؟
قبضۂ جبر میں ہیں زمین و زماں
خوف آسودہ ہے فرحتوں کا جہاں
لرزاں لرزاں سماں
اڑ رہے ہیں خلاؤں میں بن کر دھواں
کشمکش کی صعوبت کے کوہِ گراں
(الاماں، الاماں)
رنگِ انسانیت بے نشاں
بن گئی میری تذلیل کی داستاں
راز کیا ہے بتا؟
میرے اللہ میاں ----- میرے اللہ میاں

عنوان میں لہجے کی شکست کا باریک پہلو طاقت کے جبر سے ماحول کی ہیبت ناکی اور زندگی کی اکتاہٹ کو واضح کرتا ہے۔ ماحول کی ہیبت ناکی کی عکاسی موشح میں موجود ہے مگر منحنی اور پسی ہوئی آواز میں اپنے پرستارِ حق ہونے کے اظہار کے ساتھ اپنی ناتوانی کی تذلیل کا سبب قرار تو دیا گیا ہے مگر آخری مصرعوں میں یہ سوال معنی خیز ہے کہ "راز کیا ہے بتا؟ / میرے اللہ میاں / میرے اللہ میاں۔ یہ مصرعے پڑھتے ہی دوسرا مصرع ذہن میں اُبھر کر پھر کئی سوال پیدا کر دیتا ہے مثلاً پرستارِ حق ہو کر ناتوانی کا احساس کیوں ہے؟ کیا کوئی نورِ ایمان کا پاسباں ذلت کا شکار ہو سکتا ہے؟ اور یہ کہ کہیں حق گو اور صاحبِ ایمان ہونا ہی تو ضعف اور ذلت کا موجب

نہیں ہے؟ان سوالات کا جواب "باب العراق" میں شامل موشح "نظر جانب آسماں کب تلک؟"۔ "ڈرنے والے تو روز مرتے ہیں" میں موجود ہے مگر نئے عالمی تہذیبی نظام، جس کی جڑیں سفاکانہ جبر، دھوکہ دھڑی اور اقتدار و حصولِ زر کی خاطر تمام انسانی قدروں کی پامالی سے نشو و نما پا رہی ہیں۔ حنیف ترین کی کڑوی غزل کا یہ شعر:

اصول، ضابطے، قدریں، روایتیں، قانون
عدو کے وار سے پہلے انہیں تباہ کرد

عدو سے مقابلہ کے لیے انسانیت پر مبنی تمام قواعد و ضوابط کو نظر انداز کر دینے کا جواز فراہم کرتا ہے کیونکہ عدو سے نبرد آزمائی کے لیے نئی تہذیب پر عمل پیرا ہوئے بغیر زندگی کی کوئی جنگ نہیں جیتی جا سکتی۔ لیکن کیا واقعی شاعر اس ذلت آمیز فتحیابی کا دل سے خواہاں ہے؟ اور وہ اپنی ناتوانی (جو صرف زندگی کو سچائی کے راستے پر گامزن رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے) کے نتائج کو دیکھ کر اپنی ایمانی قوت کو کھو چکا ہے؟ اس حقیقت کا انکشاف شعر کی خارجی سطح پر موجزن معنویت سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ شعر کے حقیقی معنی لہجے میں موجود طنزیہ عناصر میں تلاش کرنے چاہئیں یعنی انسانی قدروں سے بے نیاز عدو کے حربوں سے تحفظ کے لیے روایت، قانون اور دیگر عظیم انسانیت کے حاصل اصولوں کو بالائے طاق رکھ دینا ہی اس لیے ضروری ہے کہ عالمی معاشرہ اب حق و صداقت کے عناصر سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ اسی طرز کا ایک آزاد موشح "مصلحت کیا بزدلی کہلائے گی۔" بھی ہے اور مکر آمیز مغربی میڈیا اور ان کی جعل سازیوں کی پول پٹی "اعلیٰ تہذیب کا دیکھیے یہ چلن۔" میں کھول دی گئی ہے۔

اکیسویں صدی کی آمد سے قبل پوری دنیا عجیب سی مسرتوں میں گم تھی لیکن جوں ہی ۲۰۰۰ء آیا ایک سال کا مغالطہ ڈال کر بحثوں کا آغاز کر دیا گیا کہ نئی صدی کا یہی سال ہے یا ۲۰۰۱ء؟ یہ بھی ایک سازش تھی (جب کہ دنیا جانتی ہے کہ ۱۰۰۰ گرام ایک کلو ہوتا ہے اس پر مزید ایک گرام کا اضافہ دوسرے کلو کا حصہ) بہر حال نئی صدی بہ اعتبار جنگی سازش ۲۰۰۱ء سے شروع ہوئی اور رقص و سرود اور شراب و کباب کی محفلوں کے ساتھ خوش فہمیاں مدہوشیوں کی نذر ہو گئیں اور پھر...... دنیا کو جدید ترین ہتھیاروں کی شرمناک تباہیوں سے دوچار کر دیا گیا--- ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کے بعد مغربی میڈیا نے جس لفظ کو بغیر کسی تشریح کے سب سے زیادہ شہرت دی وہ تھا لفظ "دہشت گرد"۔ جس کا عملی طور پر اطلاق کیا گیا صاحب شرع

مسلمان پر اور ان کے اڈے ثابت کیے گئے اسلامی مدارس-ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنے مختصر موشح میں اس حقیقت کو کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

مسجد کے مینار سے ابھری آذانیں
مکتب سے بچوں کی اٹھتی آوازیں
کالے برقعے، سبز دوپٹے، شرم وحیا
داڑھی، ٹوپی اور چوڑے چکلے شانے
یہ سب "دہشت گردوں" کی پہچانیں ہیں
امن سے جینا جن کا دوبھر ہوتا ہے
اور جینا بھی موت سے بدتر ہوتا ہے
شائستہ تہذیب کے وارث سمجھائیں؟
"دہشت گردی" کیا ہوتی ہے بتلائیں؟
کیا ہیں حقوق انسانی یہ فرمائیں؟

اس نظم کی بڑی خوبی اختصار اور جامعیت ہے۔ مصرع نمبر ۳، ۴، ۵ قافیہ سے عاری ہیں جب کہ دیگر مصرعے اس التزام سے مبرا نہیں ہیں یہ اجتہاد تخلیق کو پابند نظم سے معرا موشح کے حدود میں داخل کردیتا ہے۔ معرا، آزاد اور نثری موشحات کی خوبی ہی یہ ہوتی ہے کہ ان میں کسی روایتی پابندی کو برتنے کے بجائے انفرادی آزادی کو اس طور بروئے کار لایا جاسکتا ہے کہ صنف کے مخصوص تقاضے مجروح نہ ہوں لیکن یہ تقاضے بھی کسی مخصوص شعوری کوشش میں مواد و موضوع کے اظہار میں مانع نہیں ہونے چاہئیں۔ متذکرہ موشح میں یکساں لحن کی بازگشت کسی شعوری تراش خراش کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی مواد و موضوع کے اظہار میں آورد کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ دس مصرعوں پر مشتمل یہ شعری تخلیق معنوی اعتبار سے "کوزے میں سمندر" کے مصداق ہے۔

ڈاکٹر حنیف ترین مابعد جدید عہد کی لاتحریک نسل کے قد آور شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں مختلف تحریکات و نظریات کا خوبصورت امتزاج بھی موجود ہے لیکن زیر بحث شعری مجموعہ اردو شاعری کا واحد ایسا مجموعہ ہے جسے اکیسویں صدی کا عظیم کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حکیم منظور

فکر اور جذبہ: حنیف ترین

حنیف ترین اردو کے معروف ترین شاعر ہیں۔ سنجیدہ ادبی حلقوں میں ان کا نام احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ سیکڑوں ایسے شاعر ہیں جن کی کمر خمیدہ ہونے تک کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا۔ حنیف ترین ابھی جوانی کی پہلی سیڑھی پر کھڑے ہیں اس لیے وہ شاعری کے حوالے سے کم عمر ہیں۔ ان کی شاعری کو دیکھ کر یہ مانتے ہی بنتی ہے کہ انھیں جو راہ شناخت مل چکی ہے وہ بجا طور پر اس کے حقدار ہیں۔

اردو ادب کی دنیا وسیع و عریض ہے۔ اس میں اپنا وجود منوانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ وجود منوانے کا مسئلہ قلم کار کی اردو زبان کے ساتھ ایک غیر مشروط کمٹمنٹ(Commitment) کا متقاضی ہے اور اس صنف سخن کے ساتھ بھی پر خلوص وابستگی اور ریاض کا معاملہ اور ماجرا ہے جسے قلم کار اپنے اظہار کا وسیلہ بنائے۔ زبان کے فروغ کے ساتھ حنیف کی کمٹمنٹ کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ روش عام کے برخلاف حنیف نے اپنا مجموعہ کلام یا دوسرے رشحات قلم چھپوانے کے بجائے استادِ سخن جناب ظہیر غازی پوری کے فن اور شخصیت سے اردو دنیا کو متعارف کرانے کی غرض سے ایک کتاب مرتب کی۔ بالواسطہ یہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی سمت اٹھایا گیا ایک قابل تقلید قدم ہے۔ زبان کے ساتھ اس کمٹمنٹ کے پیش نظر حنیف صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے پر میرے دل نے آمنا و صدقنا کہا۔ مزید اردو زبان سے میری والہانہ محبت نے میرے قلم کو انگیخت کیا۔

آج کل اردو دنیا میں گروہ بندی اور دوست نوازی کا کسی جھجک کے بغیر مظاہرہ کرنا کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی۔ پہلے یہ نامناسب عمل کم بلکہ بہت ہی کم تھا۔ اس استثناء کے بجائے یہ معمول کی اور معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ اس کے سبب ممکن ہے کہ کچھ 'ایسے ویسے' لوگ 'کیسے کیسے' بن گئے ہوں مگر اردو زبان و ادب کو کتنا نقصان ہو رہا ہے اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔ کسی بھی

نقطہ نظر یا زاویہ نگاہ سے اس صورت حال کا تجزیہ کیجیے۔ نتیجے میں ایک ہی بات سامنے آئے گی۔ اس سے اردو شعر و ادب کا معیار ہی نہیں گر رہا ہے بلکہ اردو زبان کا دائرہ اثر بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ جب قاری کو عمدہ اور معیاری افسانہ یا شعر پڑھنے کو نہیں ملتا تو وہ اپنی ذہنی آسودگی کے حصول کے لیے دوسری زبانوں کے ادب کو پڑھنا شروع کرتا ہے۔ نئی حرارتوں، نئی جراحتوں اور نئے جذبوں اور فکر کی نئی جولانگاہوں سے خود کو شاد کام کرنے والے اردو سے خاصے مایوس سے لگتے ہیں۔ اس کے لیے بہت حد تک ہمارے ناقدین ذمہ دار ہیں جو گروہی تقاضوں اور علاقائی مصلحتوں کے تحت کسی اچھی تخلیق کو پست یا کسی معمولی تخلیق کو آسمان تک اٹھانے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ 'نقد کے عوض نظر' کرنے کا رجحان بڑھا جا رہا ہے۔ اسی طرح 'چندہ ادب' اچھے اچھے رسالوں کی زینت بن رہا ہے۔ 'چندہ ادا کرو، غزل چھپواؤ' یہی ایک اشتہار چھاپنا باقی رہ گیا ہے۔ ویسے رطب و یابس چھاپ کر اکثر رسالے Indirectly سراپا یہی اشتہار دیتے ہیں۔ سنجیدہ قاری اسی لیے آج کے اسّی فیصد ادب کو 'چندہ ادب' کہتے ہیں۔ یہ سارے حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ ادب میں سیاست (گروہی اور علاقائی ادیب نوازی کے حوالے سے) اور تجارت (نقد کے عوض 'نظر' کرنے کے حوالے سے) شامل ہو چکے ہیں جن کے سبب 'وذی القربیٰ' کی فوقیت کی تنقید فروغ پا رہی ہے اور کھرا کھوٹا کھرا بنایا جا رہا ہے۔ اس قابل نفریں عمل میں حنیف ترین جیسے جینوئن شاعر کو آج بھلے ہی 'وابن السبیل' سمجھا جائے مگر کل یقیناً حنیف ترین کا ہوگا۔ اس حنیف ترین کا جس کی شاعری مجموعی طور پر ایک ہی تاثر قائم کرتی ہے کہ حنیف ترین ایک جینوئن شاعر ہے۔ یہ محض ایک دعویٰ نہیں ہے اس دعویٰ کی دلیل حنیف ترین کی شاعری ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ 'نقد' کے عوض 'نظر' خرید کر کئی لوگ بے شناختی کی شناخت خریدنے میں لگے ہوئے ہیں اور حق یہ ہے کہ وہ خاصے کامیاب بھی ہیں۔ ایک اور راستہ یاران میکدۂ ادب نے یہ تلاشا ہے کہ سوقیانہ مزاج کا ادب تخلیق کر کے نام کماؤ اور یہ سوچ کہ اس سمت میں قدم بڑھاؤ کہ 'بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا'۔ اس رستے کے 'مسافر' قلم کار بھی بدنامی کے توسط سے نام کما رہے ہیں۔ حنیف ترین پر یہ دونوں ہی راستے کھلے تھے۔ چاہتے تو اپنے لیے نام خریدتے یا ایسی شاعری کرتے جو 'ادب سوز' ہوتی مگر نام تو انھیں مل جاتا۔ ان کی کیفیت مزاج سے تاہم دوسری 'صفت' سے متصف ہونا ناممکن تھا (ہے) اول الذکر راستے پر ان کے قدم اس لیے نہیں اٹھ سکتے تھے کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کیا کچھ نہیں تھا (ہے) اور کہنے کا ایک اسلوب،

ایک انداز اور ایک طرح ہے۔ وہ شاعر جو اس طرح کے خوبصورت اور تہہ دار شعر کہہ سکتا ہو کہ:

طویل رات کے ہر در پہ جا کے رو آئے
جنھیں خود اپنے ہی خوابوں کی راحتیں نہ ملیں

اداسیوں کے کھلونے سجائے طاقوں میں
کچھ آنکھوں کو بھی ننھی شرارتیں نہ ملیں

وہ کیسے نچلی سطح کی عامیانہ شاعری کرنے کی جسارت کر سکتا۔ مذکورہ دونوں اشعار میں اداسی اور مایوسی کی ایک واضح کیفیت ذہن کو اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ میرے نزدیک شعر منجملہ دوسری خصوصیت کے ایک کیفیت کا ہی نام ہے۔ اگر کوئی شعر پڑھ کر واقعی ایک کیفیت طاری ہو جائے تو شعر سے متعلق تمام لوازمات کی عدم موجودگی اس کیفیت میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ اگر شعر دوسرے لوازمات کو بھی پورا کرتا ہو اور قاری پر کیفیت بھی طاری کرتا ہو تو کیا کہیے۔ ان دو شعروں پر بھی کیا کہیے کی داد بے ساختہ منہ سے نکلتی ہے۔ ان شعروں میں جس اداسی اور مایوسی سے سابقہ پڑتا ہے اس کے بغیر زندگی یکسانیت زدہ لگتی ہے۔ رنج و غم، مایوسی، اداسی زندگی کی دھنک کے وہ رنگ ہیں جن سے فوری طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ زندگی محض انبساط نہیں۔ متضادیت زندگی کا حسن ہے اور حنیف اس رمز سے واقف لگتے ہیں۔ ان دو اشعار میں حنیف نے یہی کچھ کہا ہے۔ اپنے قاری کو زندگی کے ایسے پہلو سے جسے انسان عام طور سے دیکھنا پسند نہیں کرتے، آشنا کرنا حوصلہ چاہتا ہے۔ یہ نہیں کہ حنیف پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ایک 'تلخ سچ' کو اظہار کرنے کا حوصلہ کیا ہے۔ حنیف کے اسلوب نے اس خیال کو خوبصورت اور فکر انگیز بنا دیا ہے۔ میرا یقین ہے کہ کفر کے آداب سے واقف ہوئے بغیر ایمان کی حرارتوں اور خوشبوؤں کی لذت سے آشنائی ادھوری اور آدھی رہ جاتی ہے۔ حنیف زندگی کی مایوسی، اداسی اور رنج و غم کے دشت کفر سے گزر کر زندگی پر ایمان لانے کا جتن کرنے کا عزم اور حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کو خوبصورت بنانے کے لیے سورج کی آنکھوں کے رنگ چرانے اور ٹھہرے ہوئے وقت کی دیوار گرانے کی آرزو اور امنگ کو خون دل ملا کر جوان رکھتے ہیں:

جس رنگ سے بھر جائے گا ماتھے کا ہر ایک زخم
میں دھوپ سے کیوں آج نہ وہ رنگ چرا لوں

دو ساتھ مرا تم جو سرابوں سے نکل کر
میں ٹھہرے ہوئے وقت کی دیوار گرالوں

ان اشعار کے اسلوب اور لفظیات پر اک ذرا سی توجہ کریں تو معلوم ہو کہ یہ بالکل تازہ دم اور اپنی Setting کے حوالے سے معانی کا ایک جہانِ نو لیے ہوئے ہیں۔ پہلے رنگ، رنگ سے دھوپ، دھوپ سے رنگ، دھوپ سے سراب، سراب سے ٹھہرا ہوا وقت اس ترتیب کو الٹ دیا جائے تو یہ صورت نمایاں ہوگی۔ ٹھہرا ہوا وقت: صحرا صحرا سے سراب، سراب سے دھوپ، دھوپ سے رنگ اور رنگ سے سورج (جو لفظ دھوپ میں محذوف ہے) اس بارے میں مزید صراحت کسی اور مضمون کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ تاہم یہ بات شاید ہی کہنے کی ہے کہ دھوپ سے رنگ چرانے، وقت کی دیوار گرانے کے لیے جس عزم، حوصلے اور زندگی پر ایمان وایقان کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا راز جس کسی پر کھل جائے تو زندگی اس پر پرت پرت کھل جاتی ہے۔ حنیف اس رمز سے بھی آشنا ہیں جبھی تو دوسروں کو بھی اس رمز کے سمجھنے کی تحریک وتشویق دیتے ہیں۔

میرے نزدیک کوئی مخصوص بحر/ وزن چھوٹے بڑے کسی خیال کو ادا کرنے کا نام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا یا واقعہ ایسا ہی ہے تو ہر غیر شاعر بڑی آسانی سے خود کو شاعر کے طور پر پیش کر سکتا ہے اور اپنے ہی جیسے دوسرے غیر شاعروں سے یہ بات منوا بھی سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک صرف وہ شاعری زندہ رہے گی جو فطرت کی طرح متوقع ہو، جس کے سات رنگوں کی دھنک میں ہزاروں ہزار رنگ جھلکتے ہوں جن میں ایک غالب رنگ Down to Earth انسانی احساسات اور جذبات کا منعکس۔ ہماری شاعری میں انسان اور اس کی دلی کیفیات نہ جھلکیں تو ایسی شاعری کسی اور جہاں میں پڑھی جائے تو پڑھی جائے مگر اس دنیا میں اس کا کوئی مقام اور ضرورت متعین نہیں کی جاسکے گی۔ حنیف ترین کی شاعری اسی روداد کی شاعری ہے، اس لیے ان کی شاعری قاری میں اکثر جگہ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔

ادھر حال ہی میں حنیف صاحب کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ''زمیں لاپتہ رہی'' کے نام سے دیکھنے کو ملا۔ پہلی ہی نظم ''عرفان'' نے ہمارا دل موہ لیا۔ کتنی سادگی سے ایک اصل حقیقت جس سے زندگی کے معنی عبارت ہیں بیان کی گئی ہے۔ نظم کے آخری مصرع کو دیکھیے:

دل کی تہہ سے داغ عصیاں دھل گئے
بود اور نابود کے غم سے پرے

لمحہ جاوید میں حیراں رہا
خود کو پا کر
خود سے تھا...... میں ماورئی

جس نے 'اپنے کو پہچانا اسی نے خدا کو پہچانا' اور وہی انسان علامہ اقبال کی طرح کہہ سکتا ہے:

غافل نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

جو شخص اپنی ذات سے ماورئی ہوتا ہے وہ خدا تو نہیں بن جاتا ہے (یا بن سکتا ہے) مگر وہ یقیناً خدا کے قریب ہو جاتا ہے اور عشق کے اس مقام پر فائز ہوتا ہے جہاں سے انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ زمین و آسمان بیکراں نہیں بلکہ انسان کی زد میں ہیں۔

عشق نے اک جست میں کرلیا قصہ تمام
اس زمیں و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

(علامہ اقبال)

بھلے ہی حنیف ترین بالمشافہ اس تجربے سے نہ گزرے ہوں مگر ان کے زیر نظر نظم اس بات کا ثبوت ہے کہ حنیف صرف جذبے کے شاعر نہیں، فکر کے بھی شاعر ہیں۔ جس شاعری میں یہ دونوں خصوصیات موجود ہوں وہ معمولی اور معمولات کی شاعری نہیں کہلائی جا سکے گی۔

شاعری کسی بھی ذات کے حوالے سے کی جائے مگر جب اس میں ایسے مصرعے آجائیں تو قاری کا چونک جانا ایک فطری عمل لگتا ہے۔

آج اس پار سے دیکھو اس پار تک...... دن کے اخبار تک
دہشتیں دہشتیں
وحشتیں وحشتیں

....

خونی بارش سے دنیا پریشان ہے
خون کی بو ہے یہ
عطر سے کیا دھلے!

نہ جانے حنیف نے یہ نظم کس (Content) میں لکھی ہے مگر ہمیں مذکورہ مصرعوں میں اپنا کشمیر

بولتا ہوا نظر آیا۔ نظم کے عنوان سے لگتا ہے کہ یہ صلاح الدین پرویز کے نام لکھی گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ حنیف ترین کے ذہن میں قطعاً کشمیر، گجرات، شمال مشرقی شورش زدہ علاقے اور ہندستان کی دوسری ریاستوں کی صورت احوال یہی رہی ہوں گی مگر یہ مصرعے افغانستان، پاکستان، اسرائیل، فلسطین، الجزائر، عراق وغیرہ کی صورت حالات کے دل وجگر میں چبھنے والی روداد سنانے کا حق ادا کرتے ہیں، پس منظر یا پیش منظر کچھ اور ہے اور اطلاق کہیں اور پر ثابت کیا۔ آفاقی شاعری کی یہ ایک عمدہ مثال نہیں؟ اس نظم کا ایک اور وصف یہ ہے کہ یہ نظم در نظم کی ایک عمدہ مثال ہے۔ یہ نظم کچھ مصرعوں میں بھی مکمل ہے اور جوڑ جوڑ بھی مکمل نظم ہے۔ نہ جانے 'زمین لاپتہ رہی' کی نظموں کے مطالعے سے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ حنیف ترین اپنی فکر مطالعہ، اور حقائق سے آگاہی کی اساس کے حوالے سے بنیادی طور پر نظم کے شاعر نہیں۔ اس سے قطعاً یہ کہنا مقصود نہیں کہ ان کی غزل کسی لحاظ سے غزل کے مروجہ محاورے اور گیٹ اپ سے الگ ہے۔ نیاز فتح پوری نے جو مومن پرست تھے، نے اپنے ایک مضمون میں دلی اسکول کے چار بڑے شاعر میں لکھا ہے کہ اگر آپ نے مومن کا یہ شعر:

جان نہ کھا وصل عدو سچ سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

شعر میرے سامنے پڑھا تو میں یہی کہوں گا کہ مومن کو میرے پاس رہنے دیجیے اور باقی کو اپنے ساتھ لے جایئے۔ (اسی مومن کی شاعری اقبال کو نہیں بھائی) بہر حال یہ جملہ معترضہ ہے اسی طرح اگر آپ نے حنیف ترین کی شاعری میرے سامنے پڑھی تو میں کہوں گا کہ غزل تو سنوں گا مگر پہلے حنیف ترین کی کوئی نظم سنایئے۔ میں حنیف کی اس دعا پر آمین کہتا ہوں:

لکھنا مجھ کو ایسا ہے

جس سے روحِ انسانی	پیلا رنگ دھانی ہو
رقص کرنے لگ جائے	چاندرات رانی ہو
درد و غم کے دیوانے	خوشبوؤں کی بانی ہو
آرزو میں کھو جائیں	لمس ارغوانی ہو
میری نظموں غزلوں میں	....
رنگ کی روانی ہو	پیار کی جہاں بھر میں صرف حکمرانی ہو

✪ ✪

حنیف ترین کی نظموں کا سفر
''کتاب صحرا'' سے ''زمین لا پتہ رہی'' تک

حنیف ترین کی نظموں کو جب ان کے دو شعری مجموعوں ''کتابِ صحرا'' مطبوعہ ۱۹۹۰ء اور ''زمین لا پتہ رہی'' مطبوعہ فروری ۲۰۰۱ء میں تواتر اور استیعاب کے ساتھ پڑھا تو کئی جگہ عجیب احساس سے گزرنا ہوا۔ ایک ایسے احساس سے جس سے ہم خود اپنے تخلیقی لمحوں میں بھی دوچار ہوتے ہیں۔ جب کوئی نظم دل و ذہن میں ہیولے بنالیتی ہے اور اس کی آنکھیں کچھ کچھ کاغذ پر بھی نیم وا ہونے لگتی ہیں، اس وقت وہ نظم ہمیں اپنے سے یعنی شاعر سے چھوٹی معلوم ہوتی ہے جو اس کے فنی و تخلیقی سایۂ عاطفت میں پروان چڑھ رہی ہوتی ہے۔ پھر جب وہ اپنے پیرایۂ اظہار اور ترسیلی پیکر کو پا چکتی ہے اور ہم اسے بہ نظرِ غیر یعنی پرانی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو بسا اوقات محسوس ہوتا ہے کہ وہ نظم ہم سے بڑی ہوگئی ہے۔ اس تاثر کا اطلاق کسی ایک نظم کے تخلیقی عمل کی تکمیل پر بھی ہوتا ہے اور کئی برسوں پر محیط تخلیقی سفر کے کسی اہم موڑ پر بھی۔

حنیف ترین کے یہاں موضوعات متنوع ہیں، افکار و احساسات کی اچھی خاصی رنگارنگی ہے۔ مگر ان کی فکری و فنی ترجیحات کی بلوغت کو ان کی نظموں میں بہ آسانی قریب سے پہچانا جا سکتا ہے، مثلاً ''کتاب صحرا'' کی جن نظموں میں وطن سے دور زندگی و معاش کرتے ہوئے آدمی کی سوچ اور کرب، سعودی عرب کی مقدس سرزمینوں سے قربت و وابستگی کی راحت، پٹرو ڈالر کے عوض مشرقِ وسطیٰ میں جدید آسائشوں کے تناظر میں مادہ پرستی کے فروغ اور روحانی اقدار کے انحطاط کا ادراک ''افرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود'' میں ہونے کے سبب عالمِ اسلام پر امریکہ و یورپ کے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی دباؤ کے تحت نصف صدی سے زائد پر محیط عالمی سیاست کی صورت حال، ایٹمی جنگ کے خدشات وغیرہ جیسے جو علائق بڑی خوبصورتی اور سلیقے کے ساتھ مگر بیشتر معروضی طور پر ڈھلے ہیں، وہی تمام ''زمین لا پتہ رہی'' کی اس قبیل کی نظموں میں زیادہ

شاعرانہ حسن، عمیق نگاہی اور شعور کے وسیع ترکینوس کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ''کتاب صحرا'' کی چند نظموں کے اقتباسات میں معروضیت پر غور کیجیے۔

یہاں بھی مغربی خدا/ یہودیت کے ہم نوا/ ہیں متحد اسی طرح
کہ جس طرح فرات پر/ سوئز کے سبز گھاٹ پر/ یو، این، او کے بھیس میں
جو مسلموں کے دیس میں/ گرے تھے بن کے بجلیاں کہ ان کا یوں مٹے نشاں/ کہ پھر ابھر سکیں نہ یاں

(نظم 'بوسنیا')

ایٹامک گرد ہر سو اڑ رہی ہے
بھیانک چھتریوں میں ڈھل رہی ہے
سمندر بھاپ بن کر اڑ رہے ہیں
پہاڑوں کے بدن تک جل رہے ہیں
فضا میں تاب کاری کا دھواں ہے
اور رقصِ موت ہر سو
ہدف سے حملہ آور تک رواں ہے

(ایٹمی جنگ)

ڈالروں اور ریالوں کی چھن چھن چھنن پر
خریدے گئے لوگ بھیڑوں کے بھاؤ
صرف اور صوت/ کیا قلم اور قرطاس کیا/ ریڈیو اور اخبار کیا
ٹی وی اور فلمسازوں کے افکار کیا
گویا ہر عمر کی داڑھیوں اور مونچھوں کے سنگ
ناک کے بال تک
پونڈ اور مارک دے کر خریدے گئے
جنگ ہونی تھی آخر کو ہو کر رہی

(۱۹۹۰ء کی خلیجی جنگ کی تیسری برسی پر)

اسی سیاق میں مگر قدرے انفرادی ارتکاز کے ساتھ نظم ''احتجاج'' کے یہ ابتدائی اور آخری مصرعے بھی دیکھیے۔

ہاں یہ سچ ہے مری کاوشوں کے طفیل

رہگذاروں میں سبزہ نکل آئے گا
اونچے پربت پہ پانی پہنچ جائے گا
بحر کی تہہ میں گھر پارک بن جائیں گے
کاوشوں سے کہو

میرے سورج زمیں چاند تاروں کے ساتھ
مجھ کو بھی بوڑھا ہونے سے اب روک لیں
زندگی ہے حسیں
قیمتی اس سے دنیا میں کچھ بھی نہیں

اور اب ان اقتباسات کے موازنے میں ''زمین لاپتہ رہی'' سے دو نظموں کے حصے انہی خطوط پر اور اسی پیرایۂ ابلاغ میں مگر زیادہ توانا اور نسبتاً داخلیت سے مملو دیکھیے۔

خواہش کی تسکیں کی خاطر / اپنے لایعنی جذبوں کو
لوحِ دل پر آنک رہے ہیں
دیس بدیس کی خاک چھان کر
گرتے پڑتے پھانک رہے ہیں
اپنی دید سے غافل رہ کر / نادیدہ کو جھانک رہے ہیں

(دو دھاری)

ہوا صحرا کو کاندھے پر اٹھائے
چار سو کہرام ہنس ہنس کر مچاتی ہے
دکاں، دفتر، مکاں کیا
اب تو سوچوں پر
ردائے زرد ڈھک کر
قہقہے لمبے لگاتی ہے
تمسخر کے سروں میں
برہا گاتی ہے

(پھر اپریل کا برہا اپنے زوروں پر ہے)

حنیف ترین کا واضح مذہبی عقیدہ اور اسلامی نظریہ بھی جو ''کتابِ صحرا'' میں حمد، نعت،

مناجات کی تین اصناف اختیار کرتا ہے وہ ''زمین لاپتہ رہی'' کی دو نظموں ''عرفان'' اور ''مذہب'' میں بغیر کسی صنفِ سخن کے روایتی التزام کے Mature انداز میں ایک منضبط ایکسپریشن بن جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو نظم ''عرفان'' کا کلائمکس۔

دل کی تہہ سے داغِ عصیاں دھل گئے
بود اور نابود کے غم سے پرے
لمحۂ جاوید میں حیراں رہا
خود کو پا کر/ خود سے تھا/ میں ماورا!!

اس قسم کی کئی تقابلی مثالیں ان دونوں کتابوں کی ان نظموں سے بھی دی جا سکتی ہیں جو غریب الوطنی، گھر کی محبتوں اور آسودگیوں سے محرومی اور فرقت و ہجر کی کیفیات سے آشنا ہیں یا جو خالص موڈ اور باطنی و نفسی تجربات کی نظمیں ہیں۔ خالص فکری موڈ کی ایک نظم ''سوچ'' جو کتابِ صحرا میں ہے، اس میں سوچنے کے عمل کے نتائج کو درجہ بہ درجہ بیان کرتے ہوئے یہاں تک لایا گیا ہے۔

یوں ہی تا عمر تیرے ساتھ جب ہنس کر چلے گی
تو گونگی سوچ یہ کندن بنے گی
حیاتِ نو کے ہر اک زاویے کو
کسی دن تجھ پہ یہ روشن کرے گی

یہی فکری موڈ ''زمین لاپتہ رہی'' کی نظم، طلسم اندر طلسم میں کسی رمزیت اور اشاریت کے ساتھ ہویدا ہوا ہے۔

چاند کے اجلے ریگ زاروں میں سر بُریدہ یہ گھومتا ہے کون
بادلوں کی چمک کے پردے میں اشک زاروں سے چیختا ہے کون
کون تنہائیوں میں راتوں کی چپکے چپکے صدائیں دیتا ہے
دل کی تاریکیوں کی کشتی کو یاس کے پانیوں میں کھیتا ہے

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا حنیف کے یہاں موضوعات کا حیرت ناک تنوع بھی ہے جو شاعر کی زندگی اور زمانے کے ساتھ یک رُخی نہیں بلکہ ہمہ جہت رشتگی کی دلیل ہے۔ اس زمرے کی نظموں کو دو مجموعوں کے توسط سے تقابلی سطح پر پیش کرنا کچھ زیادہ سود مند نہیں ہوگا کہ ان کے محرکات و ملحوظات خاصے مختلف ہیں۔ البتہ اس نوع کی نظموں کا تناسب تازہ مجموعے ہی میں

زیادہ ہے۔ عشق و رومان، حسّی کیفیات، فطرت کے جمال، موسم اور مناظر کی سحر آفرینیوں، مجرد مرتکز و خیالات اور کچھ Abstract Moods سے رنگا رنگ یہ منظومے معمور ہیں۔ ایک خوبصورت کمپوزیشن ''دیوانوں کا نام ابد تک ہوتا ہے'' ملاحظہ ہو۔

سنا ہے اس نے پڑھتے پڑھتے　　آنکھوں کو حیران کیا ہے
پشت سے لپٹے آئینوں کے　　زنگاروں کا دھیان کیا ہے
صدیوں پر پھیلی ان دیکھی　　روشنیوں کا گیان کیا ہے
(پل دو پل وشرام کیا تھا)
سنا ہے اس نے لکھتے لکھتے　　دفتر میں اپنے جیون کے

اس قبیل کی نظمیں شاعر کی زندگی کے ساتھ جمالیاتی ارتباط کو بھی ظاہر کرتی ہیں اور یہ بھی آشکارا کرتی ہیں کہ شاعر تمام کرب والم کے باوجود زندگی کی مثبت اور رجائی اقدار کے حق میں ہے۔ اس موافقت کے بغیر اظہار میں دلکشی و شگفتگی پیدا ہونا ممکن بھی نہیں تھی۔ غور کیا جائے تو صرف اسی زمرے کی نظمیں ہی نہیں بلکہ اس سے قبل بھی جن مباحث کے تحت نظموں کے اقتباسات پیش کیے گئے، ان میں لفظوں کی روانی، مصرعوں کی غنائی دروبست اور ڈرافٹ کی خوبصورتی، موضوع سے قطعِ نظر بھی شاعر کے جمالیاتی مزاج ہی کی ترجمانی کرتی ہے۔ روحانی عقیدے کی راسخی اسے مزید تقویت پہنچاتی ہے۔

''کتاب صحرا'' میں شامل اپنے مضمون میں ڈاکٹر وزیر آغا نے حنیف ترین کی نظموں کی بابت بڑی متوازن بات کہی ہے:

> ''حنیف ترین کے اس مجموعے کی نظموں میں سے بعض کمزور اور بعض اچھی ہیں۔ ان کا شعری اسلوب پابند اور نثری نظم کے اسالیب کا مجموعہ ہے۔ ایک ہی نظم کے اندر پابند نظم کا آہنگ نثر کے آہنگ سے مل کر ایک انوکھی صورت میں ڈھل گیا ہے۔ ابھی ان کا یہ خاص اسلوب زیادہ پختہ نہیں ہو.......... مگر مجھے توقع ہے کہ جیسے ہی ان کے ہاں جذبات اور خیالات کا جوالا مکھی اعتدال پر آیا تو اس کے بہت اچھے اثرات ان کے اسلوب پر بھی مرتسم ہوں گے۔''

آگے چل کر ''زمین لاپتہ رہی'' میں یہ توقع خاص حد تک پوری ہوتی ہے اور ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی جیسے نقاد سے یہ رائے وصول کرتی ہے:

> ''لفظوں کو مرتب اور منظم کر کے ان کے ذریعے اپنے تشخص کو تازہ وجود دینے کے معنی

ہیں لفظوں کی اجنبیت کو ختم کرنا، انھیں درست بنانا، ان کی نزاکتوں اور لطافتوں اور معنویتوں سے آگاہ ہونا اور اس کام میں وہی شاعر کامیاب ہوتا ہے جو لفظ کا احترام کرے اور جسے معلوم ہو کہ اس کے پیش روؤں نے لفظ کو مسخر کرنے کے لیے کیا ترکیبیں استعمال کی ہیں۔''

وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں مشمولہ نظمیں مندرجہ بالا دعوؤں کی دلیل بنتی چلی جاتی ہیں۔ ہاں البتہ مختصر نظموں کو اس تجزیے سے کسی حد تک مستثنیٰ یا مبرا رکھ کر دیکھنا پڑے گا۔ مختصر نظمیں عموماً مجرد احساس، فکر یا کیفیت کی اڑتی ہوئی مختلف رنگوں کی تتلیاں ہوتی ہیں جو کبھی شاعر کی پکڑ میں آجاتی ہیں اور کبھی نہیں آتیں۔ یہ تتلیاں ان دونوں تصانیف کے گلزاروں میں اڑتی پھرتی ہیں جہاں کوئی تتلی نزاکت کے ساتھ شاعر کی گرفت میں آگئی ہے اور ایک دلکش فن پارہ بن گئی ہے۔

محفلِ یاراں میں قہوے کی ہے ہر جانب سبیل
عیش و عشرت کے نشاں ہیں زندگی کا سنگِ میل
عاقبت نا آشنا، بھولے ہیں سب رسی کی ڈھیل

(رسی کی ڈھیل)

اس کی قربت کی خواہش مجھ میں
دور تک اپنے بازو پھیلائے
ہجر کے راستوں میں بیٹھی ہے

(انتظار)

ساری رونق اور لطافت
جن رنگوں کے ساتھ بندھی ہے
وہ سکھ کے ان رنگوں کو بھی
تنہائی میں سان رہے ہیں
میرے دکھوں کو تان رہے ہیں

(ڈور کے اگلے سرے پر تنہا ہوں)

اور جہاں تتلی پکڑ میں نہیں آسکی یا شاعر کی انگلیوں پر اس کے پروں کے بس رنگ چھوٹ کر رہ گئے ہیں، وہاں اس قسم کے تشنہ و مبہم ایکسپریشن بنے ہیں۔

اجالوں میں تھکن کا تھا جو احساس اوبڑ کھابڑ ساری راہیں

اندھیرا پی کے زہریلا ہوا ہے
بدن افکار کا پیلا ہوا ہے
(المیہ)

ہر ایک گام سفر سے عاری
دن پر راتیں طاری
(امید پہ دنیا قائم ہے)

مختصر نظموں کے، جو بہرحال حنیف ترین کی نظمیہ شاعری کا ایک اہم پہلو ہے، بالکل برخلاف ''زمین لاپتہ رہی'' میں تین قدرے طویل نظمیں شامل ہیں جن میں نظم ''اک خیال آتا ہے'' کتاب کے ۲۱ صفحات پر پھیلی ہوئی خاصی طویل نظم ہے۔ حنیف ترین کی نظموں سے اب تک مانوس ہو چکے قاری کو یہ طویل نظم شروع میں شاید زیادہ قابل توقع نہ معلوم ہو لیکن آگے بڑھتے بڑھتے یہ نظم اس کی توقع سے کہیں زیادہ طمانیت بخش اور آسودہ کن ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس میں بلادِ عرب میں زندگی و معاش کا کرب و نشاط، اپنے ایامِ عشق کا، گھر کا، وطن کا ناسٹلجیا، عالمی سیاسی تناظر میں، عرب معاشرت کے تئیں ایک طرف عربوں کی بے حسی و مجبوری اور دوسری طرف ان کی حمیت و حریت کا بیان مناظر فطرت کا جمال، احساسِ عبودیت و تشکّر اپنی تخلیق، الفاظ، اشعار کے ساتھ شاعر کی والہانہ وابستگیاں، وقت اور کائنات کے رموز و اسرار کے تحت فرد کی زندگی کا استفہامیہ، المیہ و طربیہ۔ یہ سب ایک کولاج سا بناتے ہوئے ایک بے ساختہ تواتر کے ساتھ چھوٹی بحر کی اس طویل نظم کے ڈرافٹ میں ضابطہ پا گیا ہے۔ اس کی مثال میں کوئی اقتباس پیش کرنا اس لیے ناکافی ہوگا کہ یہ نظم کے وسیع کینوس کے کسی ایک ہی حصے کی نشاندہی بن کر رہ جائے گا۔ اس نظم کو حنیف کی پوری نظمیہ شاعری کا لبِ لباب بھی کہا جا سکتا ہے۔ ''پردیسی جب گھر لوٹا تھا'' اور ''ایک نظم صلاح الدین پرویز کے لیے'' بھی اسی اسٹائل کی قدرے طویل نظمیں ہیں، جو خوبصورت اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے کامیاب ہیں۔ ''ایک نظم صلاح الدین پرویز کے لیے'' کے چند دلکش اور بے حد تخلیقی درمیانی مصرعے ملاحظہ کیجیے ۔

میں نے اس سے کہا تھا
کیا تم ہی ہو نئی نظم کے بادشاہ
شاعری میں 'صلاح'
کچھ تو ہو لفظ کے دھیان میں/ گیان میں/ استعاروں کی پہچان میں
جو متن/ ایک مچھلی کہ جیسے پھسل جائے
وجدان کے ہاتھ میں آن کر

ایک جھرنا سا لفظوں سے موضوع بننے لگے
نظم، جوندیوں کی طرح گنگناتی ہوئی
پہاڑوں، سمندر کا رشتہ بناتی ہوئی!
میری اس سے ملاقات ہوتی رہی

جہاں تک غزل کا تعلق ہے (حالانکہ یہ اس مقالے کا موضوع نہیں ہے) یہ بہر حال کہا جاسکتا ہے کہ حنیف ترین ہمارے ان چند معاصر شعرا میں سے ہیں جو نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور جن کی شناخت ان دونوں اصناف میں مشترک ہے۔ ہاں مگر اس بات کی طرف اشارہ کیے بغیر نہیں رہا جا رہا ہے کہ ''کتابِ صحرا'' اور ''زمین لاپتہ رہی'' کے درمیان ''غزل نما'' کی منزل پڑتی ہے۔ یہ پورا مجموعہ آزاد غزل سے متصل ایک صنف ''غزل نما'' پر مشتمل ہے۔ اس صنف کے تعلق سے احقر کا خیال بس یہ ہے کہ یہ آزاد غزل جیسی ناگوار صنف کی بہ نسبت قدرے گوارا ہے۔ مگر قابلِ قبول نہیں ہے۔ غزل میں لفظیات، معنویت، برتاؤ، موضوع کے اعتبار سے تو گوناگوں تجربے کیے جاسکتے ہیں اور کیے گئے ہیں مگر اس کی ہیئت کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہیں کیا جاسکتا۔ حنیف نے اس صنف میں گو بہت کچھ بہت اچھے شعر بھی کہے ہیں مگر انھیں پڑھ کر یہ حسرت رہ جاتی ہے کہ کاش یہ اشعار ''غزل نما'' کے بے نور دائرے میں محصور نہ ہو کر کسی مرصع غزل کی کہکشاں میں سجتے تو ان کی چمک ہی سوا ہوتی۔

''کتابِ صحرا'' کے پس ورق پر حنیف ترین کو اپنی نظموں کے متعلق اختر الایمان کی رائے میسر آئی ہے۔ یہ یوں بھی ان کی خوش نصیبی ہے کہ اختر الایمان نے شاید ہی کسی شعری تصنیف کے بارے میں اپنی رائے رقم کی ہے۔ اختر الایمان ہی نے اپنے کسی پیش لفظ میں لکھا ہے کہ اوسط شاعری وہ ہے جسے پڑھ لینے کو جی چاہے۔ اچھی شاعری وہ ہے جسے بار بار پڑھنے کو جی چاہے اور بڑی شاعری وہ ہے جسے ایک بار اٹھائیں تو ہاتھ سے رکھنے کو جی نہ چاہے۔ میرا ادنیٰ خیال ہے کہ حنیف ترین کی شاعری کو اچھی شاعری کے خانے میں تو ضرور رکھا جاسکتا ہے، جس میں مزید وسعت اور ارتکاز کے ساتھ آگے چل کر ادب عالیہ کا حصہ بننے کے امکانات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ پھر اچھی شاعری کا ایک عام تقاضا یہ ہے کہ وہ بیک وقت شخصی بھی ہو، عصری بھی اور آفاقی بھی۔ حنیف ترین کی شاعری ان تقاضوں کو بہر حال پورا کرتی ہے۔

☆☆☆

شہناز پروین

حنیف ترین کی شاعری میری نظر میں

میرے سامنے حنیف ترین کی دو کتابیں ''کتاب صحرا'' اور ''زمین لاپتہ رہی'' ہیں۔ میں نے ان کی ابتدائی شاعری کا ایک حصہ پہلے بھی پڑھا ہے۔ ہندو پاک سے شائع ہونے والے جرائد میں ان کا کلام گاہے بہ گاہے شائع ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں دونوں میں زندگی کے بے شمار مسائل اور ان گنت سوالات موجود ہیں۔ اپنے وطن سے دوری کا احساس، آشنا چہروں کی تلاش، بادل، بجلی، بارش، پھول، تتلی، جگنو، دھنک اور بچوں سے پیار کرنے والا شاعر اپنے دل کی پیاس شاعری سے بجھاتا ہے۔ شاعری ان کے قلبی واردات، محسوسات، مشاہدات کی ترجمانی کرتی ہے۔ میں نے جب بھی حنیف ترین کو پڑھا ہے یہی محسوس ہوا کہ ان کی تمام سرگزشت ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' ہے۔ ساتھ ہی ایک گہرا احساس دردمندی ہے جو انھیں بے چین اور بے کل رکھتا ہے۔ جذبوں کی ایک آگ ہے اور ''دل سوز درونی سے جلتا ہے جوں چراغ''۔ ان کے کلام کا ایک ایک لفظ جدائی کی آگ میں جلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کتاب صحرا'' آب صحرا'' پیاس، ریت، دھوپ، دھول، غرض ہر لفظ سے جذبوں کی عکاسی کرتا ہے۔ کبھی ''یاد کے صحرا میں سوکھی لکڑیاں سلگتی ہیں'' کہیں ''بادلوں کے موسم میں ریت خواب بنتی ہے'' کہیں ''بے لباس سورج کسی کی پیاس میں پانیوں میں اترتا ہے''، کبھی سرخ خواہشوں کا سانپ انگ انگ ڈستا ہے، کبھی اک ذرا کریدنے پر ''فکر کی ایک ایک تہہ میں واہمے ہیں، چیخیں ہیں، سرد و گرم آہیں ہیں'' کہیں خواب کی دکانوں میں تتلیوں کا میلہ ہے۔ کبھی صحرا میں ''ساون کی یادیں'' ہیں، کہیں کھوئی ہوئی پہچانیں ہیں۔ بچپن ہے، جوانی ہے، پیاس ہے، برسات ہے، انجام زندگی ہے، یادوں کی بارات ہے، کہیں گونگا، بہرا، زرد سا آسمان ہے، تو کہیں زرد بستی ہے، صحرا میں زندگی بسر کرنے کا ایک جواز تو یہ بھی ہے کہ

اک پیارا سا گھر
جس کا خاکہ بنا کر تم نے دیا

کھینچ لایا یہاں
ریت ہی ریت ہے
دھول ہی دھول ہے
زرد رنگوں سے آنکھیں پریشان ہیں
سوچ بہری ہوئی
جو خیالوں میں تھی وہ چمک چھن گئی
دل کی ویرانیاں جب حد سے سوا ہوتی ہیں تو اس کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے۔
جلد آؤ یہاں
میری جانِ بہار
ورنہ ایسے میں ویران ہو جاؤں گا
جیسے صحرا یہاں دور تک دور تک
دور تک دور تک

یہ احساس تنہائی وطن سے دور زندگی گزارنے والے ہر فرد کی عکاسی کرتا ہے، یہ محض آپ بیتی نہیں ہے بلکہ جگ بیتی ہے۔ اپنے عزیز و اقارب سے دور اجنبی فضا میں زندگی بسر کرنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔ 'فراق' سونے کے صحرا میں، ایک فکر انگیز نظم بھی ہے، تمام تارک وطن ان جذبوں کی آنچ سے اچھی طرح آشنا ہیں۔

حنیف ترین نے رنگوں کے ذریعے مختلف کیفیتوں کا احساس اجاگر کیا ہے۔ رنگ ان کے یہاں خوبصورت اشارے ہیں، رنگ باتیں کرتے ہیں، ان رنگوں سے وہ جذبے اور احساس کے مختلف پہلوؤں کی بڑی خوبصورت ترجمانی کرتے ہیں جیسے

''بدن افکار کا پیلا ہوا ہے۔''
زندگی کو مت چھیڑو
یہ ہے چمپئی ناگن
دیکھنے میں پیاری ہے
کاٹنے کی عادی ہے
کربِ جاں بڑھاتی ہے

نوحے گنگناتی ہے

رنگوں کی یہ پچکاریاں خوبصورت امیجری کو جنم دیتی ہیں۔

ایک صحرائی منظر ملاحظہ ہو:

زعفران اوڑھے دھوپ
لُو کے کاندھوں پر بیٹھی
قہقہے لگاتی ہے

چند اشعار پیش نظر ہیں:

جو کھو گئی تھیں گلابی سی ساعتیں نہ ملیں

پیلی، کالی، مٹیالی سڑکیں چیخیں اور چلائیں

زرد دھرتی کی آہ و بکا
زعفرانی سی اس دھوپ میں
تیری یادوں کے طوفاں اچانک اٹھے
خشک موسم پہ شبنم اترنے لگی

مہکی رات کی رانی
سانپ سرخ خواہش کا
انگ انگ ڈستا ہے

سرخیوں پر بہاریں چھٹنے لگیں
ٹیلوں تودوں پہ کچھ سبز سے پھول کھلنے لگے

اس حسیں سرمئی اور سبز طوفان میں
کوئی پھر آئے گا

سبز گھوڑے پہ گندھک اٹھائے ہوئے
دیدنی ان ریشمی لمحات کی
لمس مخمل سائبانی اور ہے
اس کی نیرنگی کے پردے میں نہاں
کوئی رنگ ارغوانی اور ہے
سیاہ بدلیاں، دودھیا خنجر، جامنی گھٹا، دھنک رنگ، کاسنی فضا
کالی پیلی رت، امل تاس جب رنگوں کی ہولی کھیلے
بیڑی پاؤں میں خوشبو کے
رنگوں کی جلاوطنی کی خبر
صحرائے سماعت ہنستی ہے

میری نظموں غزلوں میں
رنگ کی روانی میں
پیلا رنگ دھانی ہو
چاندرات رانی ہو
خوشبوؤں کی بانی ہو
لمس ارغوانی ہو

O

سنبل کا بازار سجا تھا
یاد کے اودے نخلستاں میں
رقص و نغمہ کا اک اودھم تھا

شام کی سرخی آنکھ سے بہہ کر
دریا جیسی بن جاتی ہے

حنیف ترین کے کلام کی ایک خاص خوبی الفاظ کو نئے مفاہیم عطا کرتا ہے۔ زبان کوئی

ساکت اور منجمد شے نہیں ہے بلکہ یہ ہر آن آگے بڑھتی ہے اور نئے پیرہن میں نیا انداز پیش کرتی ہے۔ جدت اور تازگی میں اس کی زندگی ہے۔ جب تک اس سے نئے مفاہیم کو برتنے کا کام نہیں لیا جائے اس کی ترقی ممکن نہیں، زندگی اپنے تمام تر پھیلاؤ کے ساتھ رواں دواں ہے، وقت ایک سیل ہے۔ وقت کے اس دھارے میں تہذیبوں کے عروج وزوال کی داستانیں ہیں، بالکل اسی طرح فطرت زندگی اور اس کے مظاہر کو بدلتی ہوئی سماجی اور فکری صورت حال کے ساتھ زبان بھی ہر دور میں ایک نیا پیرہن لے کر آتی ہے، حنیف ترین کو زبان بیان کا درک ہے، وہ زبان کو برتنا بھی جانتے ہیں اور اسے تشبیہات، استعارات اور جدید رنگوں سے سجا کر خوبصورت، سادہ اور پُر کار انداز میں پیش کرتے ہیں، ان کا کلام مفاہیم اور لفظیات دونوں اعتبار سے جدید ہے۔

حنیف ترین اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی مختصر نظمیں ہوں یا طویل دونوں میں تاثر پایا جاتا ہے، تین مصرعوں کی چھوٹی سی نظم میں بھی وہی بھرپور تاثر ہے جو ان کی طویل نظموں میں ہے، ان کی نظموں میں طبل وجنگ کی آواز بھی ہے اور موسیقی کا رچاؤ بھی، وہ حقائق کو خلاقانہ فنکاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں جدید حسیت بھی ہے اور وقت کے تناظر میں حقیقتوں تک رسائی کی کوشش بھی ہے۔ پھر ان نظموں اور غزلوں میں غنائیت کے عنصر نے انھیں اور بھی زیادہ حسین بنا دیا ہے۔ ان کے کلام میں وطن سے دوری کا احساس ہو یا تیسری دنیا کی سسکیاں، یو این او اور نیو ورلڈ کے پس پردہ، سازشوں کا جال ہو یا محبوب کا فراق ہو، سب میں آگہی کا عذاب ہے، ان کی شاعری خوبصورت ذہن اور سچے جذبوں سے بھرپور دل کی ترجمانی کرتی ہے۔ دل میں اک آگ ہے اور ذہن سوچوں سے معمور ہے بلکہ فکری سرطان کا رشتہ جسم و جان کو اذیت کی کیفیتوں سے گزارتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ

زندگی ہے حسین
قیمتی اس سے دنیا میں کچھ بھی نہیں
پھر بھی یہ زندگی
زندگی کیوں نہیں
دائمی کیوں نہیں؟

کبھی انھیں چاند ڈھلکتا آنسو نظر آتا ہے اور کہیں ہر جگہ بے مکان خوشبو دل پر ضرب لگاتی ہے، کہیں یہ تجزیہ ہے کہ

اس کے بوڑھے چہرے کی
جھریوں کی ہر تہہ میں
وقت کی ہے سرگوشی
کہیں یہ المیہ کہ
اجالوں میں تھکن کا تھا جو احساس
اندھیراپن کے زہریلا ہوا ہے
بدن افکار کا پیلا ہوا ہے

کہیں رت جگے کا کرب ہے، کرب تنہائی ہے، کرب ملاقات ہے، غرض اک آگ ہے جو سینے کے اندر لگی ہوئی ہے۔ ایک چنگاری ہے جو شاعر کے وجود کو لحہ لحہ جَلاتی بھی ہے جلاتی بھی ہے، وہ خود بھی اس شرر کو ہوا دینا چاہتے ہیں، بظاہر زندگی کی ہر نعمت سے مالا مال ہے، آسودگی ہے، رفیقہ حیات کی خوبصورت رفاقت اور پھول سے بچوں کا معصوم اور بے لوث پیار سب کچھ ہے مگر پھر بھی کچھ ہے، کہیں کچھ کھویا ہے، کچھ ٹوٹا ہے، ایک کسک ہے، خلش ہے، جس کا اظہار جگہ جگہ ہے، جناب وزیر آغا نے کیا خوبصورت بات کہی ہے

..........'' کہ وہ دو صحراؤں کے درمیان کہیں رہ رہے ہیں، ایک طرف ریت کا صحرا ہے اور دوسری طرف پانی کا صحرا ہے، اور یہ دونوں صحرا ان کی ذات کے اندر اتر کر ایک ایسا تیسرا صحرا بن گئے ہیں جس کے قدم پانی میں اور دھڑ ریت میں ہے۔''

میری نظر میں ایک آگ کا دریا بھی ہے جو شاعر کی دور رس نگاہوں سے اوجھل نہیں جس کا اظہار نئی صلیبی جنگ ''بوسنیا'' چہل روزہ جنگ اور نیو ورلڈ آرڈر میں بڑے خوبصورت انداز میں ہوا ہے، یہ فکر انگیز نظمیں ہیں، نیو ورلڈ آرڈر میں عظیم ترین طاقتوں کے نشے کا بڑی فنکاری کے ساتھ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انسانیت کی حفاظت کی آڑ میں یہ انسان کے خاتمے کا پیش خیمہ ہے، حکم نامے کی ابتداء کے ساتھ عالمی جنگ کا امکان ہے، اگر یہی عالم رہا تو

تباہی ضرور آئے گی
تیسری جنگ سے دنیا مٹ جائے گی

یہ نظم ''کتاب صحرا'' میں ہے جو جنوری ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی ہے، اس سے ان کی دور رس نظر، بصارت اور بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ۱۹۹۵ء کی یہ پیشین گوئی آج ہمارے سامنے

ہے، اس حکم نامے نے تمام عالم انسانیت کے سینے میں خنجر پیوست کیے ہیں اور آج ساری دنیا میں جمہوریت کے علم بردار اپنی تمام تر عیاریوں اور مکاریوں کے ساتھ سب کے سامنے ہیں۔ حنیف ترین اس لہو رنگ داستان کے انجام پر خود بھی دل فگار ہیں اور ہمارے لیے بھی غور وفکر کے دروا کر دیتے ہیں۔

حنیف ترین کی شاعری مختلف مراحل سے گزری ہے۔ ان کے پہلے مجموعے سے لے کر چوتھے مجموعے تک زبان و بیان کے ساتھ فکری بالیدگی اور وسعتِ نظر کی ارتقائی صورتیں صاف نظر آتی ہیں، انھوں نے شعروادب کی دنیا میں ایک عرصہ سنجیدگی سے گزار لیا ہے۔ انھوں نے بارگاہ ایزدی میں یہ دعا مانگی تھی

میرے شعروں کو ایسی زباں کر عطا
زندگی بخش ہو میری اک اک نوا
دے ہنر مجھ کو تحریر و تقریر کا
ساز غالب کا دے، سوز دے میر کا
مجھ کو اقبال و حالی کا کردار دے
میری گفتار کو حسن گفتار دے

دردو سوز و آرزومندی سے مانگی ہوئی یہ دعا قبول ہو رہی ہے اور ''زمین لاپتہ رہی'' تک فکرو شعور کی منزلوں تک رسائی واضح طور پر نظر آرہی ہے۔ بنیادی طور پر ان کی شاعری میں اقبال اور حالی کی ذہنی رو کا زیادہ ہاتھ ہے لیکن ان کا انداز نظر جدیدیت کی طرف مائل ہے، ساتھ ہی وہ روایت کو بھی عزیز رکھتے ہیں، روایت اور جدت کے اس حسین امتزاج نے ان کی شاعری میں تاثر پیدا کر دیا ہے، ان کی نظموں کی غنائی کیفیات دلوں کو متاثر کرتی ہیں۔

''عرفان'' ایک خوبصورت نظم ہے جس کا آغاز صبح دم اللہ اللہ کی صدا سے ہوتا ہے اور انجام بود اور نابود کے غم سے دور اس احساس پر کہ

خود کو پا کر
خود سے
تھا
میں ماورا

''مذہب'' میں یہ اعتراف ہے کہ
تنہائی میں گنہ سے روکے
مجھ کو بھری محفل میں ٹوکے
خالی من میں خوشیاں بھردے
درد والم سے غافل کردے

اور پھر یہ بھی کہ مذہب کا عرفان اگر ہو تو آدمی انسان بن جاتا ہے اور دل نور کی کرنوں سے بھر جاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنے وطن سے دور صحرا میں تنہا زندگی گزارنے کے باوجود حنیف ترین کی شاعری میں کسی جگہ بھی خواہش گناہ کا تصور نہیں ملتا اور اس کا سبب گھر اور گھر والوں سے شدید محبت کے سوا کچھ اور نہیں ہے'' ان کے وجود کے گرد یادوں کی جو بیل لپٹی ہے اس کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ انھیں کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملتی، اس کا بھرپور احساس ان کی طویل نظم ''اک خیال آتا ہے، میں ملتا ہے۔ یہ محض ایک نظم نہیں ہے، ایک جیتی جاگتی حقیقت اور ایک الم ناک کہانی ہے۔ ان تمام تارک وطن لوگوں کی جو اپنے گھروں سے دور صحراؤں میں اپنے خون سے دل کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ اس میں ان تمام لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں شامل ہیں جو اس عذاب سے گزر رہے ہیں۔ اپنے گھر کے آنگن میں گلابوں کو کھلانے کے لیے کانٹوں سے دلفگار ہو جاتے ہیں۔ اس میں ایک سرمدی کیفیت ہے، اتنی روانی، بے ساختگی اور غنائیت ہے کہ شعر پڑھنے والوں پر بھی سرشاری سی طاری ہو جاتی ہے، شاعر خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رلاتا ہے، اس کے دردِ دل کی ہم آہنگی نظم میں ایک خاص رچاؤ سا پیدا کر دیتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں بھی مسائل حیات کے بے شمار پہلوؤں کی عکاسی ہے۔ غم جاناں، غم حیات جس سے منسلک غم روزگار سب مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ باطنی اور خارجی رنگوں کی اس ہم آہنگی نے نظم کو پُر اثر اور دلکش بنا دیا ہے۔ صحرا میں اپنوں کی یاد کبھی چاندنی بن کر ذہن کو اجال دیتی ہے، کہیں پیلے رنگ کو دھانی بنا دیتی ہے اور کہیں ارغوانی لمس سے شاعر کی روح کو سرشار کر دیتی ہے۔ کہیں ان کے لیے ''وقت تلخ و ساکت'' ہو جاتا ہے۔ ایک خیال کی برکتیں اسے ہسپتال میں لاتی ہیں۔

پھر خیال آتا ہے
ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں
گاڑھے خون کے رشتے

وقت اور ضرورت کی
تال پر تھرکتے ہیں
زندگی جہاں تنہا
ہم نوا کو تکتی ہے

ایک خیال سے دوسرا خیال اور دوسرے سے تیسرا اس طرح شاعر مختلف خیالوں کے ذریعے بہت سے سماجی، معاشی اور تہذیبی رویوں کی باتیں کر جاتا ہے اور آخر آخر یہ خیال آتا ہے کہ

آؤ اے حسیں لوگو
غم کو بھول کر ہم سب
پیار بانٹ لیتے ہیں
سرحدوں کی دیواریں
مل کے اب گرا دیں ہم

''زمیں لاپتہ رہی'' کی ایک اور خوبصورت نظم ''پردیسی جب گھر لوٹا تھا'' ہے۔
اس نظم میں بھی جذبوں کی آنچ ہے، احساس کی شدت ہے، شاعر فون سے ایک خبر کو سن کر پردیس سے گھر آتا ہے پھر

میری ماں کا نورانی چہرہ
بیماری کے باعث کمھلایا تھا

اس کے بعد

میرے چچا کی پھولی سانسیں
بھاری تیز آواز میں باتیں
(پیار جھڑکی، میٹھی گالی)
صبح کے ہوتے ہی جاگی تھیں
وار سے ان سے بچتے بچاتے
اپنے اندر بھاگ رہا ہوں

اسے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ

تن کی خوشبو حاصل کر کے

من کی رنگت کھو بیٹھا تھا

اپنے وطن میں پردیسی تھا

سنبھل کا بازار ہو یا گھر کی چہار دیواری، اپنے وطن کی سوندھی خوشبو پردیس سے آنے والے شاعر کے لیے فضا کو مست بنا رہی تھی۔اور—— میں پردیس سے جب گھر آیا

میری ماں بستر سے اٹھی تھی

اور میری دوشالہ اوڑھے

چل کر آنگن میں ٹہلی تھی

میں ماں سے ملنے آیا ہوں

میں ماں سے ملنے آیا ہوں

یہاں آکر بچھڑی ہوئی ماں اور دھرتی یوں باہم مل جاتی ہیں کہ یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دونوں "ماؤں" میں کچھ فرق بھی ہے یا نہیں۔ برہا کی یہ آگ شاعر کے تن من کو جلا کر رکھ دیتی ہے، راکھ نہیں کرتی بلکہ شعلہ بن کر بھڑکتی ہے۔ان کا ایک شعر ہے

دیمک بن کر دل کو کھا جاتا ہے حنیف

یوں فکری سرطان کا رشتہ ہوتا ہے

خوشی کی بات یہ ہے کہ دیمک شاعر کے وجود کو کھوکھلا نہیں کرتی بلکہ سمندر کی طرح آگ میں ہی زندہ رہتی ہے۔

میری دعا ہے کہ جناب حنیف ترین کے دل کی آگ سے فکر کا رشتہ برقرار رہے۔انھیں ابھی اس آگ کے دریا میں ڈوب کے جانا ہے۔دیکھیے پھر وہ کیسے گراں مایہ گہر لے کر ابھرتے ہیں۔

○ ○ ○

عکسِ بیں

عبدالصمد

اس سے میری بھی آشنائی ہے

بہت عرصہ گزرا، شاید ۱۹۹۵ء یا ۱۹۹۶ء کی بات ہے۔ نامور ناقد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا تھا۔ اس خوشی میں میرے عزیز دوست اور راجیہ سبھا کے اس وقت کے رکن م، افضل نے اپنی سرکاری رہائش گاہ کے خوبصورت لان میں ایک یادگار محفل کا انعقاد کیا تھا۔ دلی جو ایک شہر ہے، عالم میں انتخاب کے سربرآوردہ حضرات، ممتاز سیاست داں، مایہ ناز ادیب شریک ہوئے تھے۔ چند نام مجھے یاد آرہے ہیں۔ مفتی محمد سعید، رام بلاس پاسوان، غلام نبی آزاد، سید سبط رضی، سریش پچوری، قرۃ العین حیدر، کرشنا سوبتی، خلیق انجم، افتخار امام صدیقی، انجم عثمانی، ابن کنول .... ایک نہایت خوبصورت، خوش باش نوجوان مہمانوں کی خاطر میں پیش پیش تھا بلکہ بچھا جارہا تھا اسے ایک پل چین نصیب نہیں تھا، کبھی کسی کی تصویر کھینچتا، کبھی کسی مہمان کو کوئی ڈش پیش کرتا۔ میں نے افضل کے ہاں اس سے پہلے اس نوجوان کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سرگرمیاں دیکھ کر مجھے گمان ہوا کہ یہ افضل ہی کے گھر کا کوئی فرد ہوگا۔ اچانک افضل اسے لیے ہوئے میرے پاس آئے۔

''بھائی! ان سے ملیے ...... میرے عزیز ترین دوست، آج ہی سعودی عرب سے تشریف لائے ہیں......''

''اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے............؟''

میں نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

''بالکل ...... بالکل۔ آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ قائد کے گھر کوئی تقریب ہو اور میں شریک نہ ہوں؟ ناممکن۔''

وہ افضل کو قائد کہتے تھے۔ آج بھی کہتے ہیں۔

افضل اپنے مہمانوں کی طرف بڑھ گئے۔ وہ نوجوان میرے پاس بیٹھ گیا۔

''آپ کیا کرتے ہیں؟''

میں نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

''شاعری......''

نوجوان نے بے ساختہ جواب دیا۔

میں نے غور سے اس نوجوان کو دیکھا۔ یہ صرف شاعری کرنے اتنی دور گیا ہے سمندر پار۔
پھر سوچ کر کہ پتہ نہیں اس بات کو کریدنے میں کون سی بے معنی بات سامنے آجائے، میں نے دوسری بات شروع کردی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمارے درمیان سارے پردے اٹھ گئے اور ہمیں محسوس ہونے لگا کہ ہم تو بہت دنوں کے شناسا ہیں۔ کتنے دنوں کے......؟''

یہ تو یاد ہی نہیں............

اسی زمانے میں پروفیسر رنجن پرشاد یادو (سابق ممبر راجیہ سبھا) کی کوششوں سے پٹنہ میں غیر ملکوں میں بسے بھارتیوں کا ایک بہت اہم اجتماع ہونا طے ہوا، جس کا مقصد بہار کی صنعتی ترقی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شریک ہوں تاکہ نت نئے خیالات اور نئے نئے نقطۂ نظر سامنے آئیں۔ اس نوجوان سے بھی شاید اس کا ذکر کیا ہوگا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

اجتماع کے عین افتتاح کے دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان پٹنہ میں میرے فلیٹ میں داخل ہورہا ہے۔ ہاتھوں میں بس ایک چھوٹا سا جھولا...... میں ہکا بکا...... وہ بڑے اطمینان سے ڈرائنگ روم میں آلتی پالتی مار کے بیٹھ جاتا ہے۔

''بھائی! اسٹیشن سے آپ کا گھر تو بہت دور ہے۔ مجھے کوئی دو گھنٹے لگ گئے وہاں سے یہاں پہنچنے میں...........''

''دو گھنٹے......؟ کہیں آپ بیل گاڑی سے تو تشریف نہیں لائے...........؟''

''رکشہ سے...........اور رکشہ والے نے سو روپے چارج کیے...........''

''سو روپے...........؟ ارے بھائی، مشکل سے پندرہ روپے ہوتے ہیں اور رکشہ سے یہاں آنے میں بیس منٹ کافی ہیں۔ چار، پانچ کلو میٹر تو ہے ہی...........''

''خیر جانے دیجیے۔ بچارہ ضرورت مند ہوگا۔ پھر اس نے اپنے پیسے حلال کرنے کے لیے شہر کے بہت چکر بھی تو لگائے...........''

''لیکن آپ یہاں اچانک نازل کیسے ہوگئے؟ آنے کی خبر کی ہوتی......''

میں اسے پیار بھری نظروں سے گھورتا ہوں۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑتا ہے۔ حالانکہ ہنسی کا

کوئی موقع نہیں۔

''میں نے سوچا میں بھی تو NRI ہوں۔شاید آپ کے کچھ کام آ جاؤں اور کچھ نہیں تو کم سے کم یہ تو ہوگا کہ لوگ کہیں گے کہ آپ کی دعوت پر سعودی عرب سے یہاں آ گیا......''

وہ مجھے لاجواب کر دیتا ہے۔ میں سوچتا رہ جاتا ہوں۔عجیب آدمی ہے............

دو تین روز اس کا قیام رہا۔اس درمیان میری فیملی سے وہ یوں گھل مل گیا جیسے برسوں سے ہمارے ہاں آ رہا ہو......نہیں......لگتا وہ ہمارے ہی خاندان کا ایک فرد ہو۔''

اجتماع میں سرگرمی سے شرکت کرنے کے بعد اور نئی نئی دوستیاں حاصل کر کے وہ ان لوگوں کی تلاش میں نکل پڑا جن کے رشتے دار اس کے ساتھ عرب میں کام کرتے تھے یا کر چکے تھے۔دو ایک جگہ میں بھی اس کے ساتھ گیا لیکن یہ کام خاصا وقت طلب تھا اور کافی دقت چاہتا تھا لیکن وہ بغیر کسی الجھن کے نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کام میں مصروف رہا۔

''آپ کا پروگرام پٹنہ آنے کا تو نہیں تھا، پھر آپ کو یہ جوکھم لینے کی کیا سوجھی......؟''

میں نے اسے گھورا۔وہ ایک ادائے دلبری سے مسکرایا، پھر ہنس پڑا۔

''آف کورس۔ میرے کسی دوست کو پتا نہیں کہ میں پٹنہ آیا ہوا ہوں۔آپ نے صحیح فرمایا، میرا پروگرام یہاں آنے کا تھا ہی نہیں۔ میں جا کر انھیں سرپرائز دینا چاہتا ہوں......''

دوستوں کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کرنے کے شوق میں یہ نوجوان کافی پُرجوش تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے اسے سمجھنے کی کوشش کی۔وہ میری سمجھ میں نہیں آیا......آج بھی نہیں آتا۔

بہار نو اس دلی کے میرے کمرے پر دستک ہوئی۔اجازت لے کر اندر آنے والا کوئی اور نہیں اس نوجوان کے سوا۔ میں اچانک اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''پتا چلا آپ آئے ہوئے ہیں، بھابھی بھی۔تو میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر چلا آیا۔اپنی گاڑی بھی لایا ہوں۔جب تک آپ لوگ دلی میں ہیں، خدمت کے لیے حاضر رہوں گا......''

وہ ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہہ گیا۔

وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔پانی پیا، چائے پی لی تو میں نے عرض کیا:

''بھائی! آپ کی محبت سر آنکھوں پر، لیکن بعض اوقات آپ کی محبت غیر ضروری صورت اختیار کر لیتی ہے............''

''محبت میں تو ساری ہی باتیں غیر ضروری ہوتی ہیں صمد بھائی۔ ضروری اور غیر ضروری کا معاملہ سود و زیاں کا ہے اور محبت میں یہ نہیں چلتا............''

وہ Compromise کرنے کے بالکل موڈ میں نہیں۔

''میرے کہنے کا مطلب ہے، میرے پاس تو سرکاری گاڑی......''

میں نے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔

'میں بھی تو دلی میں ہمیشہ نہیں رہتا۔ آج ہوں تو میری خدمات بھی حاضر ہیں، نہیں رہوں گا تو آپ کو اپنی سرکاری گاڑی مبارک............''

نوجوان نے مجھے لاجواب کر دیا۔ میں نے سرکاری گاڑی واپس کر دی اور ہم اس کی کار میں نکل پڑے۔ دلی دنیا کا وہ شہر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس نے وہاں کے بازاروں میں کار چلا لی وہ دنیا کے کسی شہر میں ڈرائیونگ کر سکتا ہے۔ میں بھی یہ بات اپنے شہر عظیم آباد یعنی پٹنہ کے بارے میں کہتا ہوں لیکن یہاں اصل وجہ ٹریفک کے کسی قاعدے اصول کو تسلیم نہیں کرنا ہے اور یہاں کی شاہراؤں پر سبھی گاڑیاں بشمول بیل گاڑی (ریل گاڑی کو چھوڑ کر) انسانوں کے شانہ بہ شانہ چلتی ہیں۔

کچھ پتا نہیں کہ اس نوجوان کو دلی کی ٹریفک کے قاعدے قانون معلوم ہیں یا نہیں۔ اسٹیرنگ پر بہر کیف وہی بیٹھا تھا تو یقیناً مجھ سے زیادہ ڈرائیونگ جانتا تھا۔ جہاں جہاں ہمیں جانا تھا نوجوان کشاں کشاں ہمیں لے گیا۔ لیکن وہ دوست بن گیا۔ کہیں بھائی، کہیں بالکل ڈرائیور۔ کچھ بازاروں میں جہاں پارکنگ مشکوک تھی، وہاں وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا مونگ پھلیاں توڑتا رہا اور ہمارے بہت اصرار کے باوجود ہماری تفریح میں شامل نہیں ہوا لیکن جہاں موقع ہوا وہاں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا۔ ساڑیوں کے انتخاب اور ان کے رنگوں کے چناؤ میں بھی............

ہم علی گڑھ جا رہے تھے۔ اس نے ہمیں للکارا۔

''میں بھی علی گڑھ آؤں گا، آپ کو سلام کرنے............''

''کیوں؟ یہاں تو آپ سے ملاقات ہو ہی چکی۔ آپ نے مہمانی اور میزبانی دونوں کے فرائض بڑھ چڑھ کر انجام دے لیے پھر زحمت کیوں اٹھائیں............؟''

میں اسے روکنے کی بہت کوشش کرتا ہوں لیکن وہ فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ وہ ترین قبیلے کا فرد ہے جو دوست اور دشمن میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا اور یہ کہ جب تک وہ اپنے مہمان کو سرحدوں

سے پار نہ کردے چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔

میں ڈر گیا۔ اس قبیلے کے فرد کو غصہ دلانا ہرگز دانش مندی نہیں۔ اصل میں یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مہمان کی برکت کو جاری و ساری رکھنے کے لیے بلا تکلف اسے اپنے ہاں دفن بھی کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے دشمنوں سے اس لیے اپنے مہمانوں کو ہلاک کروا ڈالتے ہیں کہ پھر بعد میں دشمن کے مہمان کو بھی اطمینان سے مار سکیں۔

دسمبر کی سردی...... سردیوں کا موسم علی گڑھ میں کیا پورے مغربی یورپ کے لیے بطور خاص نازل ہوتا ہے۔ اترانچل بن جانے سے یوپی والوں کو شاید کچھ راحت مل گئی ہو۔ ہم ابوالکلام قاسمی کے خوبصورت مکان میں مقیم تھے۔ رات کا کھانا ختم کر کے باہر ہلکی پھلکی چہل قدمی کے بعد ہم کمبلوں میں دبکے پڑے تھے کہ باہر کسی کار کے رکنے کی آواز آئی۔ پھر برآمدے میں دستک.......... قاسمی کو اٹھ کر جانا پڑا کہ مکان انھیں کا تھا۔

''ارے بھائی حنیف ترین آئے ہیں۔ کہتے ہیں سلام کر کے انھیں فوراً واپس جانا ہے۔'' میرے ذہن و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس وقت نازل ہو جائے گا۔ دوپہر اور شام کو میں نے اس کی راہ بھی دیکھی تھی۔ نہیں آیا تو اطمینان بھی ہوا کہ چلو اسے عقل تو آئی۔ دیر ہی سے سہی۔ لیکن کیا پتا تھا کہ آفت ہمیشہ بنا اطلاع دیے نازل ہوتی ہے۔

میں تقریباً دوڑتا ہوا باہر گیا۔ یہ حضرت اپنی کار کے پاس کھڑے ایک شان دلربائی کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔ سوٹ دھول سے اٹا ہوا تھا۔ گاڑی پر اس قدر گرد جمی تھی کہ اس کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا۔ سر کے بال دھول سے بھورے ہو گئے تھے۔

''کمال کرتے ہیں بھائی آپ بھی...... بھلا اس وقت آنے کی کیا ضرورت تھی......''

میرے لہجے میں شاید ناراضگی کی بو آ گئی تھی۔ وہ معذرت خواہ انداز میں آگے بڑھے۔ مجھ سے لپٹنے کی کوشش کی پھر شاید یہ سوچ کر رک گئے کہ ان پر پڑی دھول کہیں مجھ سے نہ چمٹ جائے۔

''آپ سے وعدہ جو کر لیا تھا۔ اس کو تو نبھانا تھا نا......''

''تو اس عالم میں.........؟''

کوشش کے باوجود میرے لہجے کی ناراضگی نہیں گئی۔

''ابھی پورا حال سنیں گے تو شاید مجھے مار بیٹھیں.........''

وہ ہنس رہا تھا۔ اس کے چمکیلے دانتوں پر بھی دھول جمی ہوئی تھی۔

وہ ورانڈے ہی میں بیٹھ گیا۔ میرے اور قاسمی کے بہت اصرار کے باوجود اندر نہیں آیا۔ شاید اسے اپنے جسم سے چمٹی دھول کا شدید احساس تھا۔ سردی شدید تھی لیکن ہم سب اس حالت میں سردی وردی بھول چکے تھے۔

''مرادآباد اور سنبھل وغیرہ سے لے کر غازی آباد تک آج ایک زبردست میلہ نکلتا ہے، جس میں لاکھوں افراد حصہ لیتے ہیں۔ ندیوں میں غسل ہوتا ہے۔ ان وجوہات سے پورے علاقے میں ٹریفک تقریباً بند رہتا ہے۔ مجھے یاد بھی نہیں تھا۔ میں وعدے کے مطابق نکل پڑا تو نظارہ درمیان آیا..........''

''آپ لوٹ جاتے......کہیں سے فون کر دیتے..........''

میرا لہجہ شاید اب بھی تیکھا تھا لیکن یہ شخص تھا کہ اس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ میری ساری تیکھی باتوں کا شانت انداز میں جواب دے رہا تھا۔ اسے جو مشکلات پیش آئیں، انھیں مزے لے لے کر بیان کر رہا تھا۔ عجیب چیز تھا۔

''اف کیا جام تھا، کیا اژدہام تھا۔ گاڑیاں چیونٹیوں کی رفتار سے چل رہی تھیں۔ میری کار سیکڑوں ٹرکوں کے درمیان پسی جا رہی تھی..........''

''آپ نے جان بوجھ کر خطرہ مول لیا۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا۔ آپ کو کچھ ہو جاتا تو اس کا الزام کس کے سر جاتا..........''

میں نے اسے گھورا۔ پتا نہیں وہ شخص کس مٹی کا بنا تھا کہ اسے میرے غصے پر مسلسل پیار آتا رہا اور ہنس ہنس کر اپنا ہولناک سفرنامہ بیان کرتا رہا۔

''افسوس یہ ہے صمد بھائی کہ میں نے کیمرہ ساتھ نہیں رکھا۔ اس پورے منظر کو میں اپنے ویڈیو کیمرے میں بند کر لیتا تو کتنی یادگار اور انوکھی چیز ہوتی۔ ذرا سوچیے..........''

اس شخص سے بحث کرنا بیکار تھا۔ اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ قاسمی بھی اس عجیب الخلقت کو دیکھ کر حیران تھے۔ ابھی ہماری حیرانی ختم بھی نہیں ہوئی تھی اس نے دوسرا شاک دینے کی کوشش کی۔ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا تو میں چلتا ہوں..........''

''کہاں؟ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں حضور۔ سردی اپنے شباب پر ہے۔ آپ کسی ہوٹل میں جانے کے بجائے یہیں رہ لیجیے..........''

قاسمی نے اصرار کیا۔ وہ پھر ہنسا۔

"ہوٹل؟ بھائی جان! میں واپس جا رہا ہوں۔ صبح ہونے سے پہلے میرا مراد آباد پہنچنا بہت ضروری ہے............"

"ایں؟ اس وقت............؟"

وہ کیا کہہ رہا تھا............؟

"ہاں بھائی جان! اس وقت سڑک بالکل سنسان ہوگی۔ آنے میں جو زحمت ہوئی سو ہوئی۔ جانے میں بہت لطف آئے گا............"

"کل چلے جایئے گا بھائی۔ اس وقت جانے کی کیا تک ہے......؟"

قاسمی نے پھر کہا لیکن مرغ کی وہی ایک ٹانگ...... ہنستا ہوا مرغ............

"صبح سے پہلے پہلے میرا مراد آباد پہنچ جانا بہت ضروری ہے۔ کچھ ایسا ہی کام ہے......"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ اس شخص کو کیسے روکوں؟ کیوں کر اس کا شکریہ ادا کروں؟ وہ اتنی زحمت اٹھا کر محض اپنا وعدہ نبھانے مجھ سے ملنے چلا آیا اور اب بغیر کچھ کھائے پیئے واپس بھی جا رہا ہے۔ عجیب بندوں کو پیدا کیا ہے اس نے بھی۔

دلی میں ایک دوسرا موقع تھا۔ وہ آدھمکا۔

"رات کا کھانا آپ میرے ساتھ نوش فرمائیں گے............"

دھمکی آمیز انداز میں اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"کس خوشی میں بھائی............؟"

میں نے استفسار کیا۔

"آپ کے آنے کی خوشی میں............"

"میں تو برابر آتا ہوں۔ نئی بات کون سی ہے............؟"

میں بھی بحث کرنے کے موڈ میں تھا۔

"لیکن میں تو برابر یہاں نہیں رہتا۔ اتفاق سے اس وقت ہوں تو آپ بھی ہیں......"

بحث کرنا بیکار تھا لیکن میرے ترکش میں ابھی کچھ تیر باقی تھے۔ میں نے ایک تیر چلایا۔

"بھائی آپ جہاں رہتے ہیں، وہاں رات میں میرا پہنچنا بہت مشکل ہے۔ میں یوں بھی Route Conscious نہیں ہوں............"

''کوئی بات نہیں۔ آپ فلاں جگہ پر، فلاں بلڈنگ کے پاس...... فلاں نشانے پر آجائیے۔ میں موجود رہوں گا..........''

اس نے میرے سارے راستے بند کر دیے۔ ایک کوچۂ قاتل کے سوا۔

اس کے دیے ہوئے نشان پر جب میں کسی طرح پہنچ گیا تو وہ حضرت بڑے اطمینان سے کھڑے اپنے امپورٹیڈ لائٹر سے اپنی گھڑی دیکھ رہے تھے۔

''واہ صمد بھائی! اس کو کہتے ہیں وقت کی پابندی۔ نہ ایک منٹ آگے نہ ایک منٹ پیچھے..........''

گاڑی اس کی رہنمائی میں چل پڑی۔ میں نے سو فیصد بہانہ نہیں کیا تھا۔ میں واقعی Route Conscious نہیں ہوں۔ پچاسوں بار بھی کہیں جاؤں، پھر بھی آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔ گاڑی ایک ہوٹل..........نہیں کھانے پینے کی ایک دکان پر رکی۔ میں گاڑی میں بیٹھا رہا۔ وہ حضرت بریانی، کباب، شیر مال، کھیر اور پتا نہیں کیا کیا پیک کراتے رہے۔ میں گاڑی میں بیٹھا حیران ہوتا رہا۔ آخر ارادے کیا ہیں اس ترین پٹھان کے؟''

سامان سے لدا پھدا وہ گاڑی میں آبیٹھا اور گاڑی کو مختلف گلیوں میں گھماتا رہا۔ کچھ تاریک گلیوں میں بھی۔ آخر گاڑی ایک معمولی عمارت کے پاس روکی گئی۔ یہ اس شخص کا مکان تو نہیں۔ میں تو وہاں دو ایک بار جا چکا تھا لیکن اس وقت میں زندہ بدست تھا۔ کچھ بولنے وغیرہ کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ ظالم جو کچھ کر رہا تھا۔ اس پر بے چوں چرا عمل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ چند بوسیدہ و شکستہ سیڑھیوں پر چڑھنے کے بعد ہم ایک نہایت چھوٹے فلیٹ میں داخل ہوئے۔ ایک شخص دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ بچے ہمارے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ زوردار اور مبالغہ آمیز انداز میں میرا تعارف کرایا گیا۔ ہم سب ایک چوکی پر بیٹھ گئے جس پر ایک ملگجی سی چاندنی بچھی تھی۔ مہمان نے ڈرامائی طور پر اب میزبان کے فرائض اختیار کر لیے تھے۔ ایک دسترخوان طلب کیا۔ درمیان میں اسے سلیقے سے بچھایا گیا۔ اندر سے چند پلیٹیں آگئیں۔ ساتھ لائے گئے کھانے کے پیکٹ کھولے گئے اور......

تو یہ تھی ہماری دعوت..........''

بعد میں اس نے مجھے تفصیل بتائی کہ صاحب خانہ اس کے دیرینہ دوست تھے اور وہ میرے ساتھ ان کی اور ان کے بچوں کی دعوت بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس

بنے یہ انوکھی ترکیب نکالی۔
اس شخص سے دور نزدیک کے جو بھی تعلقات رہے، ایک بات نمایاں اور بنیادی طور پر سامنے آئی کہ اس کی محبت ہمیشہ یک طرفہ ہوتی ہے۔ وہ محبت کے معاملے میں لین دین کا بالکل قائل نہیں۔ جسے چاہتا ہے بس اسے چاہتا ہے۔ بدلے میں کچھ نہیں چاہتا۔ چاہت بھی نہیں۔ وہ مجھے لگاتار خط لکھتا رہا۔ عید اور نئے سال کے کارڈ بھیجتا رہا۔ جب بھی کوئی قابل ذکر چیز اس کی چھپی اس نے بطور خاص مجھے اطلاع دی۔ جب بھی اس کی کتاب چھپی اس نے فوراً مجھے بھیجنے کا اہتمام کیا اور جواب میں.........؟

خاموشی...... مکمل خاموشی..........

مگر بعض اوقات خاموشی بے حد بولتی ہوئی ہوتی ہے۔ سیکڑوں تقریروں اور بے شمار بیانوں پر بھاری.......... ایک مکمل زبان جو کاغذ پر لکھی نہیں جاتی، کسی زبان سے ادا نہیں کی جاتی، کانوں کان سفر نہیں کرتی، محسوس کی جاتی ہے.........

صرف محسوس......

یہ شخص جو گوشت پوست کا بنا ہوا ہے...... اعلا تعلیم یافتہ، اپنی ذمے داریوں سے پوری طرح بہرہ ور، فرماں بردار اولاد، شفیق باپ، چاہنے والا شوہر، قابل اعتماد دوست، لائق بھروسہ رفیق، پُر جوش شاعر...... سب اپنی جگہ لیکن اس کی شخصیت دراصل محسوس کرنے کی چیز ہے۔ اس کا خلوص اور اس کی محبت روح کی گہرائیوں تک اتر جانے والی شے ہے اور میں نے روح کی گہرائیوں میں اسے محسوس کیا ہے۔ خاموشی اس انمول احساس کو اپنی حفاظت میں رکھے ہوئے ہے۔

میں نے حنیف ترین کی شاعری پر کوئی اظہار خیال نہیں کیا، ان کی ادبی حیثیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ میں نہیں جانتا وہ کیسے شاعر ہیں، ان کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ یہ کام ناقدین کا ہے اور میں ان کے کام میں دخل اندازی کرنا نہیں چاہتا لیکن میں نے ایسے بہت لوگوں کو دیکھا ہے جو ادیب تو شاید بڑے ہیں، شخصیت میں کوئی بڑا پن نہیں۔ بھئی اگر تم بڑے فنکار ہو تو بڑے انسان بھی تو بنو۔ ایک ادیب کو تو چند سو یا چند ہزار جانتے ہیں۔ ایک انسان کو لاکھوں...... اس لیے پہلے بڑا انسان، پھر بڑا ادیب.......... حنیف ترین یقیناً ایک بڑے اور اچھے انسان ہیں تو ایک اچھے شاعر بھی ضرور ہوں گے۔ یوں ان کی شاعری کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو ان کے سامنے بہت سارا وقت پڑا ہے۔

☆☆☆

صلاح الدین پرویز

ایك آف لو، بھے، ٹریو ڈیسپیر
قطبی مکتبہ اور زمین لا پتہ رھی

Wind whines, and whines the shingle
The crazy pierstakes groan
A senile sea numbers each single
Slimesilvered stone
From whining wind and colder
Grey sea I wrap him warm
And touch his trembling fineboned shoulder
And boyish arm

Around us fear, descending
Darkness of fear above
And in my heart how deep unending
Ache of love!

(On the Beach at Fontana— James Joyce)

جیمس جوائس کی مندرجہ بالا نظم "how deep unending— ache of love" کے یہ آخری چھ لفظ ہیں۔ یہ نظم on the beach at fontana، بارہ مصرعوں پر مشتمل

ہے۔ یوں تو پوری نظم، میں جس اردو شاعر کی شاعری کے بارے میں لکھ رہا ہوں اس کا پرولاگ ہے، لیکن نظم کے آخری چھ لفظ اس شاعر کی شاعری کی آتما میں کچھ اس طرح پیوست ہیں کہ یہ پیوستگی ہی اسے ایک اچھا سچا شاعر بناتی ہے۔ ایک مرتبہ فیض احمد فیض صاحب نے کہا تھا کہ یار لوگ ہر وقت ادب کا رونا روتے رہتے ہیں... انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آج کل ادبی حلقوں میں دو چار سوال اکثر سننے میں آتے ہیں۔ پہلا سوال، کیا ہمارے شعری ادب پر جمود طاری ہے۔ دوسرا سوال، کیا وہ شاعری جسے جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے، نثری نظم، آزاد نظم، تغزل سے عاری غزل وغیرہ وغیرہ—— اس جمود کا توڑ نہیں ہے۔ تیسرا سوال، کیا نئے لکھنے والوں میں کوئی ہونہار بردا ایسا نہیں ہے جس کے چکنے چکنے پاتوں سے کچھ امیدیں وابستہ کی جاسکیں... یہ بات فیض احمد فیض صاحب نے شاید ۱۹۸۱ء یا ۱۹۸۲ء میں کہی تھی... میں یہ بات کتنی ہی بار کہہ چکا ہوں اور آج فیض صاحب کی زبانی دوبارہ کہنے کی پھر جرأت کر رہا ہوں کہ جس دن ادب پر جمود طاری ہو جائے گا یا جس دن ادب کی ارتھی اٹھ جائے گی، اُس دن بھگوان کی بھی ارتھی اُٹھ جائے گی... میرے پیارے بھائیو! بھگوان میں اور ادب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن یہاں میں اس ادب کی بات نہیں کر رہا جو ہرا ایرا غیرا نتھو خیرا لکھ رہا ہے... میں اُس ادب کی بھی بات نہیں کر رہا جس میں لوگ خود کو خدا بنانے کے لیے ادب کا پریوگ کر رہے ہیں، اُس کے لیے رسالے بھی نکال رہے ہیں، بڑے بڑے انعام خود سے خود کو دلوا رہے ہیں اور مونچھوں پر تیل لگا کر خود کو بھگوان سمجھ کر سارے دنیا کے سچے ادب کو دولتیاں مار رہے ہیں... حالانکہ بھگوان کا پیشہ دولتیاں مارنا نہیں بلکہ اس کا پیشہ تخلیق گری ہے۔ اسی تخلیق گری سے شیشہ گری تخلیق پاتی ہے اور اسی تخلیق گری سے کوزہ گری بھی تخلیق پاتی ہے... تخلیق گری کا سلسلہ اتنا طویل ہے کہ اَنت بھی اُس طویل سلسلے کے بہت پیچھے دور کہیں غبار میں گم ہو جاتا ہے...

آئیے جناب اب ہم رلکے کی شاعری کے بارے میں چند معتبر ادیبوں کی رائے پیش کرتے ہیں:

"رلکے کے اسالیب کا دائرہ اتنا کشادہ تھا کہ اس کی وسیع ہمدردی اور رویے اپنے عملی اثرات یا منطقی اعتبار سے ایک دوسرے کو خارج کرتے اور ایک دوسرے کی تردید

کرتے رہتے تھے۔''

—ہمبرگر

''رِلکے کے اساطیری مدرکات پر ہمیں فلسفیانہ تصورات کا ڈھانچا نہیں منڈھنا چاہیے۔ اس کی شاعری کی اکتشافی معنویت اس نظام فکر سے بہ درجہا بڑھ کر ہے جو اس کے کلام سے اخذ کر کے تشکیل کیا جا سکتا ہے۔''

—جے۔ بی۔ یشمن

''رلکے کے خیالات کو کھینچا تانی سے کسی طرف لے جا سکتے ہیں، مگر وہ خود انہیں کسی سمت فلسفیانہ طور پر نہیں لے گیا۔ اس نے شعری طریق سے انہیں پروان چڑھایا اور ان سے اعلیٰ درجے کی شاعری پیدا کی۔

—ڈی۔ جے۔ ایزایٹ

''ان مرثیوں کے لفظی حسن سے لطف اٹھانا اور کلام کی موسیقیت سے اثر پذیر ہونا میں اپنے لیے کافی سمجھتا ہوں، ان کے ''فکر'' میں رسائی کی کوشش میں بہت بادل ناخواستہ کرتا ہوں، کیوں کہ یہ فکر میرے لیے مشکل بھی ہے اور میرے مزاج کے ناموافق بھی۔''

—ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں یہ مضمون کس شاعر پر لکھ رہا ہوں جس کا نام ابھی تک میں نے اس مضمون میں نہیں لیا ہے۔ لیکن دوسروں کے حوالوں پہ حوالے دیتا جا رہا ہوں... چلئے حوالے کی اس رسم کو زندہ رکھتے ہیں اور آپ کو رِلکے کی ایک نظم سناتے ہیں...

میں گویا پرچم ہوں جس کے ہر سمت وسعتیں اور دوریاں ہیں
ہے ان ہواؤں کا ہوش مجھ کو، جو چلنے والی ہیں اور جنہیں مجھ پہ بیتنا ہے
اگرچہ نیچے ابھی کسی شے میں کوئی حرکت نہیں ہوئی ہے
سہج سے بند ہو رہے اب تک کواڑ سارے، ہے چمنیوں میں سکوت طاری
ابھی دریچوں کو کپکپاہٹ نہیں چڑھی ہے، ابھی ہے گرد و غبار بھاری

ادھر مجھے آندھیوں نے آ بھی لیا ہے، لہر رہا ہوں کہ جیسے ساگر
میں کھل کے لہراتا اور سمٹتا ہوں اپنے اندر
جھپٹتا ہوں میں اشتعال بن کے
کہ سہہ رہا ہوں اکیلا طوفاں

میں ہوں اکیلا، بہت اکیلا!

اوپر ابھی آپ کے لیے میں نے رِلکے کی ایک نظم quote کی ہے۔ رِلکے کے بعد اب میں کافکا کی ڈائری سے آپ کے لیے کچھ سطریں quote کرتا ہوں:

"When despair shows itself so definitely, is so tied to its object, so pent up, as in a soldier who covers a retreat and thus lets himself be torn to pieces, then it is not ture despair. true despair overreaches its goal immediately and always, (at this comma it became clear that only the first sentence was correct)".

کافکا کی ڈائری کی ان سطروں کے بعد، میرے خاطر ذرا 'دیوان شمس تبریز' کے یہ تین اشعار بھی سن لیجیے:

دو رخ عشق نگرتا بصفت مرد شوی
پیش سردان منشین کز دمشان سرد شوی
از رخ عشق بجو چیز دکر جز صورت
گاہ آنست کہ با ہمرہ ہمدرد شوی
چون گلوخی بصفت تو بہوا بر نشوی
بہوا برشوی ارشکنی و کرد شوی

ان تین شعروں کی گہرائی میں اگر اُترا جائے تو ہمارے پاس یہ چند معنی کی سطریں آتی ہیں۔

"اے، ذرا عشق کے چہرے کا دھیان کر کہ تو ہوسکتا ہے عاشق۔ تلاش کر عشق کے چہرے سے خوبصورتی کے علاوہ بھی کچھ ہے کہ تجھے ایک مہرباں حبیب کی ضرورت ہے... تو منجمد ہے۔ اس لیے تو کبھی ہوا کی سربلندیاں طے نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر تجھ میں ٹوٹ کر بکھرنے کی طاقت ہے اور تو ریت بن سکتا ہے تو ضرور ہوا کی سربلندیاں تیرا مقدر بن سکتی ہیں۔"

میں نے جس شاعر کے لیے اتنے بہت سارے اقتباس نقل کئے ہیں۔ اُن کا مطلب صرف اس شاعر کے لیے ایک thesis تعمیر کرنا تھا... سو، جو thesis تعمیر ہوا، وہ مندرجہ ذیل ہے...

۱- جیمس جوائس کی نظم on the beach at fontana کے یہ آخری چھ لفظ "how deep unending— ache of love"

۲- رِلکے کے اسالیب، اُس کے اساطیری مدرکات، اس کی فلسفے سے بے اعتنائی اور اس کی اعلیٰ تخلیق شناسی اور اس کی تنہائی۔

۳- کافکا کا true despair

۴- دیوانِ شمس تبریز کے شعروں میں باطنی شکست و ریخت کا سیریو۔

محترم قارئین! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے عام نقادوں کی طرح دوسرے نقادوں کے اتنے حوالے کیوں دیے ہیں... معاف کیجئے گا میں نے یہاں کسی نقاد کا حوالہ نہیں دیا۔ بلکہ تخلیق کاروں کے حوالے دیے ہیں جو عام طور سے کم دیے جاتے ہیں۔ میں جس شاعر پر یہ مضمون لکھ رہا ہوں، وہ اردو کا شاعر ہے۔ لیکن میں نے کسی اُردو کے شاعر یا ادیب کے حوالے اس مضمون میں زبردستی نہیں ٹانکے... سچی بات تو یہ ہے اور جسے ہمیں قبول کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہونا چاہیے کہ آج لٹریچر ایک چھوٹے سے cathode screen کا بندی یعنی قیدی ہوگیا ہے۔ اب ہمیں اتنی جرأت ہونی چاہیے کہ ہم باہر کے ادب سے آنکھ سے آنکھ ملا کے گفتگو کرسکیں... وہ زمانے بیت گئے، جب بہت سارے ادیب اور شاعر، باہر کے ادیبوں اور شاعروں کے ترجموں سے اردو میں (اردو کے علاوہ اور بھی بہت سی زبانیں ہوسکتی ہیں) اپنے نام کے گھوڑے دوڑاتے تھے... اب ان ادیبوں اور شاعروں کا حشر کیا ہوا... وہ سارے ادیب و شاعر اب مٹی کے سوکھے تغاروں کی طرح گھٹنوں کے بل اوندھے ہوگئے...

میرا شاعر جس پر میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں وہ ایک انتہائی original شاعر ہے۔ اس نے کبھی کسی کی نقل نہیں کی۔ اس نے جیسا بھی لکھا، جتنا بھی لکھا، سب اپنا لکھا، اسی لیے اُس کی شاعری میں ایک گہری معصومیت اور ایک گہری پُراسراریت شامل ہے... اب میں یہ

عرض کرنا چاہوں گا کہ میں نے جیمس جوائس کی وہ آخری چھ لائنیں جن کی اردو شکل یہ ہوسکتی ہے "کتنا گہرا ہے یہ احمق — محبت کا غم"... میں جس شاعر کے بارے میں یہ سب لکھ رہا ہوں، آیئے اس کا نام بتاتا ہوں۔ اُس کا نام ہے حنیف ترین۔ اب آپ حنیف ترین کی یہ نظم پڑھیے اور اس میں جیمس جوائس کی طرح محبت کے اُس غم سے لطف اٹھایئے جو حنیف ترین کی اس نظم میں خود بخود، معصومیت کے کسی سرشار اور پراسرار زمزمے کی طرح زمزمہ خوانی کر رہا ہے...

پٹ بھڑ کے بستر میں
تنہا حاملہ شب
بچ تنترپہ نیند کی
تاک دھنا دھن کرتی ہوئی
جنگل رقص میں کھوتی ہے
اک ڈائن جیسی ہوتی ہے
اور کہیں تو
ٹوٹے پھوٹے خوابوں کے
ٹیڑھے میڑھے ویرانوں میں
چاند کا قتل
بیڑی، پاؤں میں خوشبو کے
رنگوں کی جلاوطنی کی خبر
صحرائے ساعت بنتی ہے

حنیف ترین نے جیمس جوائس کو پڑھا ضرور ہے، لیکن اسے اپنی شاعری میں داخل نہیں ہونے دیا۔ حنیف ترین جب بھی شاعری کرتے ہیں، میرے خیال میں دوسروں کے سارے دروازے، کھڑکیاں، یہاں تک کہ روشن دان بھی بند کر کے گھپ اندھیرا کر لیتے ہیں... اس گھپ اندھیرے میں جب چاروں سمتوں کے پٹ بند ہوں اور گھپ اندھیرا ہو، تب درویشی

تخلیق کار کے باطن کی پٹ کھل جاتی ہے اور "collective memory" خدائی پروائی کی طرح اُس کے پاس چلی آتی ہے، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ایسی نظم لکھواتی ہے... انہوں نے اس قسم کی ایک نظم ہی نہیں لکھی بلکہ ایسی کئی نظمیں اُن کے یہاں موجود ہیں۔ ان نظموں کی موجودگی میری thesis کے پہلے حوالے کی توثیق کرتی ہے۔ اس توثیقیت کے لیے آپ ان کا مجموعہ کلام ''زمین لا پتہ رہی'' پڑھ سکتے ہیں۔

اب میں اپنے thesis کے دوسرے موڑ پر آتا ہوں۔ اِس موڑ پر میں نے رِلکے کے اسالیب، اُس کے اساطیری مدرکات، اس کی فلسفے سے بے اعتنائی، اس کی اعلیٰ تخلیق شناسی اور اس کی تنہائی کی بات کی تھی۔ یہ بات حنیف ترین کی شاعری پر کتنی صادق آتی ہے، آپ ان کی یہ چھوٹی سی نظم پڑھ کر خود محسوس کر سکتے ہیں... لیکن نظم پڑھنے سے پہلے میری اس بات کو بھی دھیان میں رکھئے گا کہ حنیف ترین کی شاعری vision کی شاعری نہیں ہے۔ یہ شاعری perception کی شاعری ہے۔ میری ناقص رائے میں vision ایک محدود لفظ ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ vision تو ہر ایک کے پاس ہوتا ہے، لیکن perception بہت نایاب شے ہے۔ اس کی وابستگی میں ہمیشہ ایک 'عرفان' اور کرامت مرقص رہتی ہے۔ یہ perception ہی رِلکے کو عظمت اور رفعت عطا کرتا ہے، اور جب اس perception میں اساطیری مدرکات، فلسفے کی فرقت، اعلیٰ تخلیق شناسی اور تنہائی کا 'بھے' شامل ہو جائے تو آپ اس کو 'سوم رس' کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہی 'سوم رس' ہے جس کا پالن، سورگ میں دیوتا کرتے ہیں اور جس کا لیکھن دھرتی پر تخلیق کار کرتے ہیں... حنیف ترین کی شاعری 'اسلوب' کی شاعری نہیں بلکہ 'اسالیب' کی شاعری ہے۔ اسلوب کی شاعری سے ان گنت مثالیں ہندستانی ترقی پسندوں کی شاعری سے دی جا سکتی ہیں۔ بلکہ ساری ترقی پسند شاعری، سر پا تک 'ڈکشن' محض ڈکشن یعنی اسلوبی کی شاعری تھی... اسالیب کے شاعروں یا ادیبوں کی بات کی جائے تو ان میں میر، غالب، بیدی، منٹو، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین جیسے لوگوں کے نام آتے ہیں... حنیف ترین اسی صف میں داخل ہونے کی پرجوش اور پرزور کوشش کرر ہے ہیں... دعا ہے کہ وہ اِس صف میں مستقبل قریب میں صلوٰۃ تہجد ادا کر سکیں... حنیف ترین کی اساطیریت میں مذہب یا عقیدہ شامل نہیں ہے۔ اُن کے اساطیریت میں آم کے باغ،

کوئل کی کوک، سرسوں کے کھیت، پپیہے کی آواز... بھری دوپہری باوری اِکلی دُکلی مت جا، وغیرہ وغیرہ اَن گنت مٹی سے جڑی ہوئی آوازیں اور رِشتے ناطے شامل ہیں۔ یہ آوازیں، یہ رشتے ناطے مختلف اسالیب میں، اُن کے ذاتی perception کے ساتھ، ایک شدید بھے کی دستک لیے ان کی شاعری میں بازگشت کرتے رہتے ہیں... حوالے کے لیے اُن کی یہ چھوٹی سی نظم پڑھیے اور قرۃ العین حیدر کے ''اسنو بیری کے شگوفے'' کا لطف اٹھایئے...

ساری رونق اور لطافت
جن رنگوں کے ساتھ بندھی ہے
وہ سکھ کے ان رنگوں کو بھی
تنہائی میں سان رہے ہیں
میرے دکھوں کو تان رہے ہیں

نظم پڑھ کے کیا آپ کو میرے thesis کے دوسرے موڑ کے مرجان کا ''لولوئے جاں'' یعنی ''احساسِ ازکراں تا کراں'' ہوا یا نہیں...

اب میں اپنی thesis کے تیسرے موڑ، یعنی کافکا کے true despair پر آتا ہوں۔ کافکا کی پوری زندگی ایک سچے دکھ کے ساتھ وابستہ تھی۔ یہ دکھ اُسے اپنے بدن سے ملا تھا، جو آہستہ آہستہ اُس کی آتما میں شامل ہوکر بڑ کا پیڑ بن گیا تھا۔ اسی لیے اس کا ہر لیکھا جوکھا، ادب کا true despair یعنی سچا دکھ بن گیا... اسے آپ ''کافکائی نروان'' بھی کہہ سکتے ہیں... حنیف ترین کی شاعری میں اُس کا اپنا سچا دکھ شامل ہے، جو دھیرے دھیرے اس کی شاعری میں پنپ رہا ہے۔ ہوسکتا ہے ایک دن یہ چھوٹا سا پودا، تناور بڑ کا درخت بن جائے اور ایک حقیقی نروان کا درجہ پراپت کرلے... حنیف ترین کی شاعری میں اِس true despair کو دیکھنے کے لیے، ایک نظم حاضر خدمت ہے...

سنا ہے اس نے پڑھتے پڑھتے
آنکھوں کو حیران کیا ہے
پشت سے لپٹے آئینوں کے

زنگاروں کا دھیان کیا ہے
صدیوں پر پھیلی، اَن دیکھی
روشنیوں کا گیان کیا ہے
(پل دو پل وشرام کیا تھا)
سنا ہے اس نے لکھتے لکھتے
دفتر میں اپنے جیون کے
دن کاٹے تو
راتوں کا وردان دیا ہے
گہری فکر کے موٹے موٹے
شیشے پہن کر
لفظوں میں نئے معنی اور مفہوم سمو کر
اور گمان کے دروازوں پر
نئے طور سے دستک دے کر
فکر کی اونچائی سے گزر کر
بڑے بڑے انعام ہیں پائے
دنیا کے سمان اٹھائے لیکن اب تو
اپنے آرٹ کے تاج محل میں
اک تصویر سا لٹکا ہوا ہے

اوپر کی نظم کی قرأت کے بعد، مجھے امید ہے کہ میری thesis کے تیسرے موڑ کو مورد مل گیا ہوگا۔

اب آیئے thesis کے انتم موڑ پر یعنی دیوانِ شمس تبریز کے شعروں میں باطنی شکست و ریخت کا سنیریو... ''دیوان شمس تبریز'' مولانا روم کی ''کتاب عشق'' ہے۔ یہ کیسی کتاب عشق ہے جو آج تک نہ لکھی گئی ہے اور نہ لکھی جائے گی۔ اِس کتاب عشق کو پڑھ کے پانی

میں آگ لگتی ہے اور آگ میں زیریں ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ اِس کتاب عشق میں سورۂ کوثر سا اختصار بھی ہے اور الف لیلہ و لیلہ سے کہیں زیادہ بڑی پراسراریت اور رمزیت بھی ہے... اِس کتاب عشق میں شکست و ریخت کا وہ طوفان بے پناہ ہے جس میں انسان تو کیا، فرشتوں کی بھی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں... شکست و ریخت کا یہ سنیر یو کائنات در کائنات سفر کرتا ہوا 'سدرۃ المنتہیٰ' تک پہنچتا ہے۔ یہ کتاب گو مولانا روم نے اپنے حبیب شمس تبریزی کی فرقت میں رقم کی تھی۔ دنیا کو کیا پتہ تھا کہ یہ فرقت کی شکست و ریخت ایک دن ایسے عشق کے سولہ سنگھار اور 'نو رس' کا گھول تیار کرے گی جس کو پی کر وحدتی اور وجودی اور لا وجودی سارے مکاری، موسیٰ کی طرح صحو کی سیڑھیاں چڑھ کے کوہِ طور پہ تجلّی بے کراں سے ہم کنار ہوں گے... معاف کیجئے گا، میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ حنیف ترین مولانا روم کی ٹکر کے شاعر ہیں، لیکن حنیف ترین نے جس مکتبے میں admission لیا ہے اس مکتبے کے قطب مولانا روم ہیں... اس مکتبے میں باوضو ہوکر ہی آدمی، ان کے اجازت نامے کے ساتھ ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کے اپنا دایاں پاؤں دھرتا ہے... اب اس کو کیا کہا جائے کہ حنیف ترین کی شاعری کو وہ اجازت نامہ مل گیا ہے اور انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کے قطبی مکتبے میں اپنا دایاں پاؤں دھر دیا ہے... ثبوت کے لیے یہ نظم حاضر ہے...

دل میں رہتی ہیں
مری خواہشیں
ہر شب کی سحر ہونے تک
ہر اندھیرے کے فنا ہونے تک
آسمانوں سے کسی، آہٹ کا گماں ہونے تک
اُکھڑی سانسوں کے جدا ہونے تک!

اب اس کے بعد میرا کچھ بھی لکھنا آپ میں اور حنیف ترین کی شاعری میں مخل ہونا سمجھا جائے گا، اور میں کسی کی بھی تخلیق میں مخل ہونا اپنے لیے ناجائز اور بدترین فعل گردانتا ہوں...

✪✪✪

پروفیسر سیدہ حنا

اکیسویں صدی کا جینوئن شاعر: حنیف ترین

حنیف ترین ایک خوبصورت تخلیقی ذہن رکھتا ہے۔ اس کی سوچ کا زاویہ اپنے دور کے شعرا سے بالکل ہی مختلف ہے۔ نہ وہ اپنے خیال کو دھند میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے اور نہ اظہار کے لیے ایسے لفظوں کا سہارا لیتا ہے جو کثرت استعمال سے اپنا حسن اور اپنی معنویت کھو بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی لفظیات خود تراشتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس تراش خراش میں کہیں کھردرا پن رہ جاتا ہے ممکن ہے درسی قسم کے نقاد اس کے اس رویے پر معترض ہوں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہی کھردرا پن اس کی پہچان بن گیا ہے۔ قاری جلد ہی اس کی لفظیات سے مانوس اور آشنا ہو جاتا ہے اور پھر ان نامانوس لفظیات سے تخلیق کے چشمے پھوٹتے ہیں تو پھوٹتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اس کی شاعری میں انجذاب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

رام، راون، کمپیوٹر، شطرنج، ایڈس، ڈھول، بھینٹ، بدرو، سل، ادھڑنا، بالو، ایڈس، مشینیں جیسے الفاظ کی وجہ سے بعض اشعار ناتراشیدہ ضرور محسوس ہوتے ہیں لیکن ان کا چارم کم نہیں ہوتا مثلاً:

دن میں رام اور رات میں راون

ذہن شطرنج سے پڑتی رہی بارود کی شہ
شہر میں خوف کے مہروں کا جو دربار چلا

دیوتا نے سجا کے مندر کو
خون کی بھینٹ لی خدائی سے

رفاقت کی بدرو میں سڑنا پڑا ہے

مصائب کی سل سے رگڑنا پڑا ہے

اسی رت میں ہم کو ادھڑنا پڑا ہے

آنکھ تھی زرد بالو کا

وقت بھی جب اپنا بوجھ نہیں ڈھوتا

کمپیوٹر کی سبز بتی جل گئی

مشینیں ایڈس کی بیماری بن کر

ابھی یہ الفاظ ہمیں زیادہ تر حنیف کی شاعری میں ہی نظر آئے ہیں جیسے جیسے اس کی شاعری عام ہوگی پڑھنے والے پڑھیں گے اور جس تناظر میں انھیں استعمال کیا گیا ہے اس سے ان الفاظ کی اہمیت واضح ہوتی جائے گی اور ان کی اجنبیت اور نامانوسیت بھی کم ہوتی چلی جائے گی۔ غالب نے اپنی شاعری میں ''دھول دھپا'' اور ''اوک'' جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے اور بالآخر کثرت مطالعہ نے ان کے اجنبی پن کو دور کردیا اور آج ہم بڑے اعتماد سے وہ اشعار پڑھتے ہیں جن میں یہ لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نامانوس الفاظ کا استعمال شاعر کا عجز ظاہر کرتا ہے یہاں عجز والی کوئی بات نہیں ہے۔ حنیف کے ذہن میں خیال اور موضوع کا ایک جنگل اُگا ہوا ہے اور ہر خیال اور ہر موضوع اس سے تقاضا کررہا ہے کہ پہلے مجھے لکھو۔ موضوعات اور خیالات کے سیلاب میں الفاظ اور تراکیب اس کا ساتھ نہیں دے رہی ہیں لہٰذا اس کو ان خیالات اور ان موضوعات کو گرفت میں لانے کے لیے خود اپنی لفظیات اور اپنی تراکیب تراشنی پڑ رہی ہیں۔ تراش خراش کے اس عمل میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے لیکن کہیں کہیں اسے مروجہ بحور اور اوزان سے بھی بغاوت کرنی پڑی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں۔ میں نے پہلے کی طرح یہ درج ذیل تراکیب بھی کتاب صحرا اور زمین لاپتہ رہی سے انتخاب کیے ہیں۔ آپ ان تراکیب سے حنیف کی تخلیقی قوتوں کا اندازہ کرسکیں گے۔ ان تراکیب کے حسن اور ان کی معنویت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

حق کی کہکشاں، خال وخد کی ڈگر، ایٹا مک گرد، خوف کا تالا، تکراروں کی میل، شک کی ناگن، انا کا شیش محل، وقت کی بجلی، شہرت کی اونچی گلیاں، بدنامی کی ریت، بدصورت بدبو، گونگی سوچ، قربتوں کی خوشبو، پانیوں کا پہرا، سانپ سرخ خواہش کا، تتلیوں کا میلہ، زعفران اوڑھے دھوپ، چھپی ناگن، بے مکان خوشبو، خواہشوں کا میلہ، خواہشوں کا جنگل، انا کے پھول، عمر کی ڈھلانیں، سبزہ زاد دیواریں، تذبذب کا گنبد، خوف کی دھول، ریشمی لحات، لمس مخمل، خون اگلتی ساعتیں، آزمودہ دھند، نامساعد ذات، خوابوں کا بستر، شیشے کا دریا، دودھیا خنجر، اشک زار، یاس کے پانی، معاشیاتی ہواؤں کی یورش، ادب کا کیمیا، نئے تقاضوں کے جدول، خیال سبز، جشن حرف وصوت، معنی شب بیدار، فرحت نورستہ، پت جھڑ کے بستر، حاملہ شب، رنگوں کی جلاوطنی، صحرائے سماعت، نخل طلب، انا گزیدگی، ذات کی دلدل، ثقافت کی منڈی، روبوٹی تہذیب، خوف کی دیمک، سپاٹ اکتاہٹیں، کڑوی شامیں، لفظوں کی ریوڑ، فکر کی زریں کان، شہر ہوس، خنک بیداریاں، نخل بدن، آئینے کی بانہیں، خوشبوؤں کی بانی، لمس ارغوانی وغیرہ۔

اب یہ بھی دیکھنا ہے کہ شاعر نے ان کو اپنے اشعار میں کس رنگ سے باندھا ہے

تھکی زمیں پہ حق کی کہکشاں اجال دیں

میں بہت دیر تک
اپنی صورت کو درپن میں تکتا رہا
خال وخد کی ڈگر پر بھٹکتا رہا

ایٹا مک گرد ہر سو اُڑ رہی ہے
بھیانک چھتریوں میں ڈھل رہی ہے
سمندر بھاپ بن کر اُڑ رہے ہیں

مستقبل کے دروازے پر
خوف کا تالا جھول رہا ہے

سوچ کے تابندہ چہرے پر
تکراروں کی میل جمی ہے
انسانی رشتوں کے گھر میں
شک کی ناگن آ بیٹھی ہے

کیا پھرانا کے شیش محل پر
وقت کی بجلی آن گری ہے
شہرت کی اونچی گلیوں میں
بدنامی کی ریت اُڑی ہے
اخباروں کی ہر سرخی سے
بدصورت بدبو چھٹی ہے

قربتوں کی خوشبو کا
آبشار بہتا ہے

خوف کے جزیروں پر، پانیوں کا پہرا ہے

مہکی رات کی رانی
سانپ سرخ خواہش کا
انگ انگ ڈستا ہے

کچی عمر کیا جانے
تتلیوں کا میلہ ہے
خواب کی دکانوں میں

زعفران اوڑھے دھوپ
لو کے کاندھوں پہ بیٹھی
قہقہے لگاتی ہے

زندگی کو مت چھیڑو
یہ ہے چھپی ناگن
دیکھنے میں پیاری ہے

چودھویں رات کے حسیں رخ پر
چاند جیسے ڈھلکتا آنسو ہے
ہر جگہ بے مکان خوشبو ہے

سرد سرد راتوں میں
اس کی گرم یادیں بھی
خواہشوں کا میلہ ہیں

خواہشوں کے جنگل میں
کھیل کالے جادو کا
آگ سی لگاتا ہے
جب شباب آتا ہے

وہ انا کے پھولوں کو
کیسے توڑ سکتا ہے
دل نشیں اصولوں کو

عمر کی ڈھلانوں پر
قہقہہ خموشی ہے
اور اندھیرا جیوتی ہے

میں خلاؤں سے آگے گیا
گو تذبذب کے گنبد سے چمٹا رہا

دیدنی ان ریشمی لمحات کی
لمس مخمل سائبانی اور ہے
خوں اگلتی ساعتوں کے عکس میں
آئینوں کی ضو فشانی اور ہے

نامساعد ذات کے ابہام میں
ہم نے اب کے دل میں ٹھانی اور ہے

نکلنے لگتا ہے پتھر سے شیشے کا دریا
جو دودھیا خنجر مجھے چبھوتی ہیں
نیندیں خوابوں کا بستر دکھاتی رہیں

معاشیاتی ہواؤں کی یورشوں پر بھی
ادب کا کیمیا بکھرا تو طشت زر میں رہا

نئے تقاضوں کی جدول کی سرخیوں کے طفیل
مرور وقت ہر اڑتی سی اک خبر میں رہا

جشن حرف و صوت منانے کی خاطر
معنی شب بیدار بچاکر رکھ لینا

حنیف ترین

احساس نارسائی کی بنجر زمین کو
کس کے خیال سبز نے بالیدہ کردیا

ذہن میں صبح و مسا
اک عجب فرحت نورستہ سفر کرتی تھی

پت جھڑ کے بستر میں
تنہا حاملہ شب
پنچ تنتر پر نیند کے
تاک دھنا دھن کرتی ہوئی
جنگل رقص میں کھوتی ہے

انا گزیدگی تنگی میں عیش کوش رہی

روبوٹی تہذیب چمکتی دوری ہے

خوف کی دیمک
بے دردی سے
اجلی نیند کو چاٹ رہی ہے

باجرے کے کھیتوں میں
عشق دندناتا ہے
سبزہ زاد دیواریں
مستیوں میں ڈھاتا ہے

اپنے نخل بدن کی نمو کے لیے
شب کے ماتھے پہ انجم سجایا کرو

آئینے کی بانہوں میں
جب وہ جھولنے آئے
پینگ لے کے شرمائے

حنیف ترین کی تازہ تر لفظیات اور خود ساختہ خوبصورت تراکیب اس بات کی غماز ہیں کہ وہ جینوئن شاعر ہے۔ جذبات کے اظہار کے لیے اس کے پاس خوبصورت لفظوں اور دلکش تراکیب کی کمی نہیں ہے۔ زندگی اور اس کے دھنک رنگوں کا اس نے بغور مشاہدہ کیا ہے۔ اس کے موضوعات اور اس کی لفظیات پر نظر پڑتی ہے تو وہ ان شعرا سے بالکل مختلف ہے جو ۱۹۸۰ء کے بعد ابھر کر سامنے آئے۔ اس کا انداز، اس کا لہجہ، اس کا ڈکشن ان سے بالکل الگ ہے۔ اس کی شاعری کا تعلق کمپیوٹر ایج سے ہے وہ بیسویں صدی کا شاعر نہیں ہے بلکہ اکیسویں صدی کا شاعر ہے۔ وہ اپنے ہم عصر شعرا کی بھیڑ میں شامل ہو کر بھی ان سب سے الگ ہے۔

اس کا تازہ مجموعہ کلام ''زمین لاپتہ رہی'' کا سن اشاعت ۲۰۰۱ء ہے۔ میں یہاں اس کی چند نظموں کے صرف عنوان دے رہی ہوں ان ہی سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اپنے ہمعصروں سے کتنا مختلف ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''بند گھروں سے لٹکی زبانیں'' ''ڈور کے اگلے سرے پر تنہا ہوں''، ''جب ترسیل بٹن تک پہنچی''، ''سانپ کا سایہ خواب مرے ڈس جاتا ہے''، روبوٹی تہذیب چمکتی دوری ہے''، ''خوف خوشیوں کی خوشبو کھا جاتا ہے''، ''خواہش بازو پھیلاتی ہے''، پیڑھ کا میل کہاں دکھتا ہے۔''

وہ اکیسویں صدی میں اپنے ایک خوبصورت اور نئی سوچ سے مزین شعری مجموعے کے ساتھ داخل ہو چکا ہے اور اس عہد کے تقاضے جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کمپیوٹر کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے، اس کا اپنا ایک آپریٹنگ سسٹم ہوتا ہے، کمپیوٹر کی اپنی ایک الگ دنیا ہے اور آج کے ادب کو اگر زندہ رہنا ہے تو اس دنیا سے جڑ کر چلنا ہوگا۔ وہ نئی نسل کا ذہین نمایندہ ہے اور اسے علم ہے کہ اس کو اپنے لیے قاری پیدا کرنے ہوں گے جو آج کی اصطلاحات کو سمجھ کو اس کی شاعری سے لطف اندوز ہو سکیں۔ میں نہیں جانتی کہ یہ اس کی شعوری کوشش ہے یا یہ سب اس کے لاشعور کی کرشمہ

سازی ہے کہ اس کی شاعری میں ایسے نئے پن کا احساس ہوتا ہے جو اجنبی بھی ہے کھرد را بھی لیکن اس کی رسائی ذہن و دل تک ضروری ہے۔ میں یہاں اس کی ایک مختصر معنی آفریں اور دل گداز نظم پیش کر رہی ہوں اس میں وقت کے تسلسل کو زمینی حقائق کے تناظر میں کس سچائی سے پیش کیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

زمیں لکھی
آسمان لکھے
تمام تر بحر و بر
نشان کون و مکان لکھے
مگر ہے باقی ابھی بہت کچھ
جو ضبط تحریر سے پرے ہے
جو لکھ چکے ہیں
اسے تھکا کل

نئی رتوں کے
تھکے ہوئے دن کو
سونپ دے گا

(سلسلے ہی سلسلے)

اس کی نظموں میں اتنی گہرائی اور گیرائی ہے کہ ان میں ڈوب کر ابھرنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ کم و بیش یہی حال اس کی غزلوں کا ہے:

احساس نارسائی کی بنجر زمین کو
کس کے خیال سبز نے بالیدہ کر دیا

ہر جگہ پتھروں کی بارش ہے
سر دعاؤں سے ڈھک لیا جائے

جس کے لیے صدیاں کئی تاوان میں دی ہیں
وہ لمحہ تو مٹھی میں جکڑنے کے لیے تھا

چاند الفت کا استعارہ ہے
جس کی جانب سبھی چکور چلیں

یوں دبے پاؤں آئی تیری یاد
جیسے چپکے سے شب میں چور چلیں

بعد اس کے بستروں میں تھیں حنیف
شب گزیدہ خواب اور گولیاں

اس کی شاعری کا چمن آج کی خوشبو سے مہکا ہوا ہے۔ اپنے عہد سے اس کا رشتہ استوار ہے اور جب میں یہ کہتی ہوں کہ وہ اکیسویں صدی کا جینوئن شاعر ہے تو دراصل وہ اکیسویں صدی کا جینوئن شاعر ہی ہے۔

⭘ ⭘ ⭘

قمر سنبھلی

حنیف ترین کا شعری سفر

بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں اردو کے مطلعِ شعر پہ جو چند نام تیزی سے ابھر کر سامنے آئے ہیں اور جنھوں نے اپنی شناخت قایم کی ہے ان میں جناب حنیف ترین کا نام بہت اہم ہے۔ ''جدیدیت اور مابعد جدیدیت'' کے لفظی گورکھ دھندوں سے بے نیاز نئی جہتوں کی تلاش میں سرگرداں حنیف ترین کو کسی خاص ازم یا گروہ سے وابستہ کیے بغیر ایک تازہ دم اور تازہ کار شاعر کی حیثیت سے دیکھا اور سمجھا جانا چاہیے۔ وہ محض اپنے آپ کو جدید شاعر منوانے کے لیے خواہ مخواہ چونکا دینے والے لایعنی افکار و خیالات سے دور رکھتے ہوئے جو نئی لفظیات اور نئی زمینوں میں اپنے خیالات کے گل بوٹے سجاتے ہیں وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں جدت کا ایسا شدت پسندانہ رخ نہیں ہے جہاں ترسیل ایک المیہ بن جائے۔ ان کے اشعار ہمیں دعوتِ غور و فکر دیتے نظر آتے ہیں ان کے یہاں شدتِ احساس کے ساتھ جذبات کی فراوانی اور فکر کی پاکیزگی ملتی ہے اور ایک متوازن لہجہ جو بڑا خوشگوار ہے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ حنیف ترین ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ کشادہ ذہن بھی ہیں مگر ان کی ذہنی کشادگی بے راہ روی کہیں قبول کرتی نظر نہیں آتی۔ وہ جس قصباتی اور مذہبی ماحول کے پروردہ ہیں اس اعلیٰ مقام پر پہونچنے کے بعد بھی پرانی اقدار سے دامن کو سجائے ہوئے ہیں۔ مذہب سے وابستگی کو قابلِ فخر ہی نہیں سمجھتے بلکہ بین السطور میں اس کی اعلیٰ روایات و اقدار صاف محسوس کی جاسکتی ہیں۔ ان کے لہجے میں کرختگی یا جارحانہ انتہا پسندی نہیں ہے۔ یہی اعتدال و توازن ان کی شاعری کو پرکشش اور حسین بناتا ہے۔ حنیف ترین کی شاعری کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے یعنی تقریباً صرف ۲ دہائیوں پر محیط کہی جاسکتی ہے۔ مگر اس کم مدت میں ان کے چار شعری مجموعے منظر عام پر صاحبان نقد و نظر کو متوجہ کر چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ کلام ''رباب صحرا'' ۱۹۹۳ء میں منظرِ عام پر آیا تھا جو تقریباً تمام غزلوں پر مشتمل تھا۔ دوسرا شعری مجموعہ ''کتاب صحرا'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا جس میں تمام تر نظمیں ہیں۔ تیسرا مجموعہ

ایک ہیئتی بحر پر مشتمل ''کشت غزل نما'' کے نام سے ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آیا یہ پورا مجموعہ ''غزل نما'' کے تجرباتی اشعار سے پُر ہے چوتھا اور اب تک کا آخری اور تازہ ترین مجموعہ ''زمین لا پتہ رہی'' کے نام سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے جس پر سن اشاعت ۲۰۰۱ء رقم ہے۔

یہ آخرالذکر مجموعہ غزلوں اور نظموں دونوں پر محیط ہے۔ حنیف ترین کے ان تمام مجموعوں کو پڑھنے کے بعد فیصلہ کر پانا مشکل ہے کہ وہ غزل کے شاعر ہیں یا نظم کے۔ ان کے یہاں دونوں کی تعداد تقریباً برابر برابر ہے اور کیفیت کے اعتبار سے بھی نظم و غزل دونوں متوجہ کرتی ہیں اور اپنا اپنا الگ تاثر چھوڑتی ہیں۔ ''کتابِ صحرا'' پر تقریض لکھتے ہوئے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے حنیف ترین کو بنیادی طور پر غزل کا شاعر قرار دیا ہے۔ چونکہ اس وقت تک ان کا صرف غزل کا مجموعہ ''رباب صحرا'' ہی منظر عام پر آیا تھا اسی لیے شاید عاشق صاحب نے یہ نتیجہ نکالا۔ اب جب کہ نظموں کا ایک مکمل مجموعہ اور حالیہ مجموعہ غزل اور نظم دونوں پر مشتمل ہے، اس لیے شاید اب ان کو بھی اپنی رائے میں ترمیم کرنی پڑے۔ حنیف صاحب نے اپنے خیالات کے اظہار کا دونوں کو ذریعہ بنایا ہے اور وہ دونوں میں کامیاب نظر آتے ہیں اور اب اس بحث کی کوئی خاص اہمیت نہیں کہ وہ غزل کے شاعر ہیں یا نظم کے۔ وہ دونوں پر قدرت رکھتے ہیں اور جیسا خیال جس صنف میں اظہار کا بہتر موقع فراہم کرتا ہو وہ اسی صنف میں اس کو بیان کر دیتے ہیں۔ حنیف ترین کے یہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ نئے نئے لفظوں کی تلاش کے ساتھ الفاظ کا برمحل انتخاب اور پرانے الفاظ کو بھی نئے ڈھب سے برتنے کا سلیقہ ہے جس کی وجہ سے لفظ و معانی کا خوبصورت سنگم ہوگئی ہے ان کی شاعری۔

یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ جن سے شاید میری بات کی کچھ تائید ہو سکے۔

انگڑائی لی سحر نے تو لمحے چہک اٹھے
جنگل میں ورنہ رات کے خوف و ہراس تھا
نئے تقاضوں کے جدول کی سرخیوں کے طفیل
مرورِ وقت ہراڑتی سی اک خبر میں رہا
خون اگلتی ساعتوں کے عکس میں
آئینوں کی ضوفشانی اور ہے

حنیف ترین کے یہاں لفظوں کی تلاش کے ساتھ تازہ کاری کے نمونے صفحہ صفحہ پہ

بکھرے ہوئے ہیں جوان کے ذہن کی اپج کے ساتھ نئے نئے زاویوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور اپنے اظہار کے لیے نئی زمینوں کی تخلیق بھی۔ دراصل اپنی بات کو مؤثر ڈھنگ سے پیش کرنے کے لیے اچھی زمین کا انتخاب بھی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی حنیف ترین اپنی خوش مذاقی کے ساتھ ذہانت کا ثبوت دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں۔ ان میں فکر بھی ہے، جذبہ بھی ہے اور جستجو بھی۔

پیار کی رمِ جھم صحرا میں بکھرے گی!
سوکھا پیڑ بھی پھل دے گا کل پرسوں میں

حسد کی کالی آنکھ تم کو آئینہ دکھا سکے
کسی پہ کھل کے یوں نہ اپنا انکشاف کیجئے

وہ لذتِ نادیدہ کی ترسیل تھا شاید
تمثیل میں جو رنگِ مصور نہیں آیا!

صحرا کی بشارت پہ بھی، شاہین کے ڈر سے
باغوں میں زمانوں سے کبوتر نہیں آیا

حنیف ترین کے یہاں صرف خشک مضامین اور فکر و فلسفہ ہی نہیں ہے تغزل کی نرم و نازک رم جھم بھی ہے۔

دل کی دنیا عجیب دنیا ہے
عقل کے اس پہ کچھ نہ زور چلیں

کون آیا آنکھیں روشن ہوگئیں
کھل گئیں پھر دل کی ساری کھڑکیاں

قامتوں کے کئی منظر ابھرے!
جب کہیں رت کوئی دھانی دیکھی

حنیف ترین جن حالات میں گزر بسر کررہے ہیں اور جوان کی کھلی آنکھیں منظر دیکھ رہی ہیں ان کے عکس ان کے یہاں نظر آنا تعجب کی بات نہیں مگر وہ ان حالات سے مایوس نہیں۔ نہ وہ حوصلہ ہارتے ہیں بلکہ حوصلہ ہارنے والوں سے وہ شکوہ کناں نظر آتے ہیں۔

جہاں پہ ظلم کو قسمت سمجھ کے لوگ جئیں
وہاں تو میرے لیے دن گزارنا مشکل

اسی طرح انھیں روتے بسورتے چہرے بھی پسند نہیں۔ اپنے رخ پر ماتمی غازہ کی نمائش کرنے والوں کے لیے ان کا مشورہ ہے۔

رونے دھونے والوں میں
سات سروں کے سرگم بانٹ

وہ خود ایک مدت سے اپنے وطن سے دور غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں مگر خود کو بکھرنے سے محفوظ رکھے ہوئے ہیں اس سلسلہ میں خود کہتے ہیں:

عُرعُر مرے سنبھل سے بہت دور ہے لیکن
اچھا ہوں جہاں بھی ہوں حنیف اس کے کرم سے

اپنے فکر و فن اور شاعری کے متعلق خود ان کا نظریہ کیا ہے اس شعر میں ملاحظہ فرمائیں:

مری تخلیق وجہ ارتقائے فن رہی ہے
لکیروں کے فقیروں سا سخنور میں نہیں ہوں

حنیف نے ''لکیر کا فقیر'' ہونے کی نفی ضرور کی ہے مگر ''روایت کو'' یکسر رد نہیں کیا ہے۔ وہ کلاسیکی ادب سے رشتہ استوار رکھتے ہوئے نیا پن لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ روایت سے بغاوت ایک نعرہ ضرور ہے مگر اُس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جو لوگ خود کو روایت شکن کہتے ہیں اور بظاہر شعوری طور پر اس کو رد کرنے کی اور اس سے انحراف کی کوشش کرتے ہیں وہ غیر شعوری طور پر کہیں نہ کہیں روایت سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں اس لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی قلم کار اپنی روایت سے قطعاً غیر متعلق ہو سکے۔ حنیف ترین کی شاعری اسی لیے پُرکشش ہے کہ اس نے روایت سے رشتہ استوار رکھتے ہوئے نئے چیلنجوں کا سامنا کیا ہے۔ یہ خوبصورت شعر دیکھیں جس میں روایت کا حسن بھی ہے اور جدت کی ادا بھی۔ اور غزل کے تمام تقاضوں کا لحاظ بھی۔

لپٹیں تری یادیں جو مرے پیکر غم سے
اک چہرہ ابھرنے لگا کاغذ پہ قلم سے

حنیف کو حالات سے نبرد آزمائی میں لطف آتا ہے۔ اور انھوں نے سخت سے سخت حالات میں اپنے وجود کو ٹوٹنے بکھرنے سے بچائے رکھنے کی سعی کی ہے:

مرے وجود کے تنکے بھی لے اڑی ہوتی
ہوا کو میری جسارت نے بڑھ کے روک لیا
میں ہواؤں کا تیز جھونکا ہوں
کوئی روکے مجھے مجال کہاں

حنیف دنیا کی سفا کی اور حالات کی ستم ظریفی پر قہقہے بھی لگانا جانتے ہیں۔

حنیف مجھ کو ذرا قہقہہ لگانے دو
کہ زندگی کی حقیقت بیان ہوتی ہے
خامشی کا مذاق اڑانا ہے
آج پھر قہقہہ لگانا ہے

حنیف ترین اپنے ان معاصرین سے بھی ناخوش ہیں جو بیساکھیوں کے سہارے زندہ ہیں یا بے معنی استعاروں کو اپنے فن کا محور بنائے ہوئے ہیں۔

بیساکھیوں کے ساتھ کہاں تک چلیں گے آپ
کیوں لڑکھڑا رہے ہیں مرا ہاتھ چھوڑیے

اور

حنیف کھو گئے بے معنی استعاروں میں
غزل کو جن سے رہی آن بان کی خواہش

حنیف ترین جن قدروں کے دلدادہ ہیں ان میں بزرگوں کا احترام اور ان کی دعاؤں کے سائبان کی اہمیت نمایاں ہے۔ تبھی وہ اس طرح کے اشعار کہہ سکے:

ہر جگہ پتھروں کی بارش ہے
سر دعاؤں سے ڈھک لیا جائے

حنیف کو اپنے بچپن کی یادیں ہمیشہ گھیرے رہتی ہیں۔ اور وہ تتلیاں اڑاتے ماضی کو فراموش نہ کر سکے۔

مل کے بچپن کے سات رنگوں سے
تتلیوں کی طرح اڑا جائے

بچوں جیسے کچے ذہن کے آنگن میں
روز سنہرے خواب کی تتلی اڑتی ہے

اب تک ہم نے حنیف کی غزل پر گفتگو کی مگر ان کی نظم بھی غزل سے کم اہمیت کی حامل نہیں۔ انھوں نے بالعموم مختصر نظموں کے ذریعہ اپنے کسی خیال کو اظہار کی زبان دی ہے۔ مگر ان کے یہاں کئی طویل نظمیں بھی ملتی ہیں۔ تازہ مجموعہ ''زمیں لاپتہ رہی'' میں ۲۱ صفحات پر محیط ایک طویل نظم ہے جس کا عنوان ہے ''اک خیال آتا ہے'' یہ نظم خاصی متاثر کن ہے۔ اس کے علاوہ ''پردیسی جب گھر لوٹا تھا'' اور ''ایک نظم صلاح الدین پرویز کے لیے'' بھی خاصی طویل نظمیں ہیں۔

اسی طرح ''کتاب صحرا'' جو صرف نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے، اس میں بھی کئی نظمیں خاصی طویل ہیں جن میں ''لا الہ الا اللہ'' ''محمد الرسول اللہ اور'' مناجات'' قابل ذکر ہیں۔

ان کی نظموں میں یوں تو ہر نظم اپنی جگہ خوب ہے مگر جو نظمیں زیادہ متاثر کرتی ہیں ان میں، عرفان، مذہب، طلسم اندر طلسم کیسا، فلک جہاں اترتا ہے، مشورہ، ڈش انٹینا، ایسا کیوں ہوتا ہے، ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء، رمز ہی رمز، عشق، ڈوبے ڈوبتے تجھ کو لکھنا آساں کب تھا۔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ کچھ مختصر نظمیں یا ان کے اقتباس ملاحظہ ہوں:

''سبز گنبد'' کے عنوان سے سہ مصرعی نظم دیکھیں۔

کتنے انسان سکون پانے کو
سبز گنبد سے لپٹے رہتے ہیں
ابرِ رحمت برستا رہتا ہے (کتاب صحرا)

یہ نظم دیکھیں عنوان ہے ''مذہب''

''تنہائی میں گنہ سے رُوکے/ مجھ کو بھری محفل میں ٹوکے/ خالی من میں خوشیاں بھر دے/ دردوالم سے غافل کر دے/ مذہب کا عرفان اگر ہو/ تہذیبوں کا گیان اگر ہو/ میں انسان ہوا ہوں جب سے/ نورانی ہے دل کی دھرتی تب سے۔ (زمین لاپتہ رہی)

کاغذ، رنگ قلم اور خوشبو/ تجھ کو کب سے ناپ رہا ہوں۔ (زمین لاپتہ رہی)

ایک نظم ''سچے باقی رہ جاتے ہیں'' کے آخری چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

........یہ دنیا/ یہ پیاری دنیا/ شعلہ شعلہ ہو جائے گی/ اس سے پہلے آؤ لوگو/ ہم اچھوں

کو تسلیم کریں/ ہم بچوں کی تعظیم کریں/ جب جھوٹ فنا ہو جاتا ہے/ سچے باقی رہ جاتے ہیں۔ (کتاب صحرا)

ایک اور نظم دیکھیں جس میں حسنِ فطرت کی کیسی تصویر کھینچ دی گئی ہے عنوان ہے ''ساون رت'' بارشوں کے موسم میں/ سبزے لہلہاتے ہیں/ چھیڑ سے ہواؤں کی/ پیڑ جھوم جاتے ہیں/ پتے نرم شاخوں پر/ تالیاں بجاتے ہیں/ دشت گیت گاتے ہیں......(کتاب صحرا)

ایک اور نظم ''کربِ تنہائی'' ملاحظہ ہو:

اس کی تلخ یادوں کا/ ہاتھ لے کے ہاتھوں میں/ کتنا بھٹکوں راتوں میں .....(کتاب صحرا) جوانی کیا رنگ دکھاتی ہے اس کا ایک اسکیچ دیکھیں عنوان ہے ''جوانی''

خواہشوں کے جنگل میں/ کھیل کالے جادو کا/ آگ سی لگاتا ہے/ جب شباب آتا ہے.....(کتاب صحرا) غرض حنیف ترین کی کتنی ہی ایسی نظمیں ہیں جن کا ذکر کرنا چاہتا ہوں مگر خوف طوالت مانع ہے۔

جناب علیم اللہ حالی حنیف ترین کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''وہ شعری ہیئتوں کو روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جب ان کی تحریر سے تخلیق کا سوتا پھوٹتا ہے اور ایک چشمے کی طرح سامنے آتا ہے تو قاری فکر وانبساط سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔'' (فلیپ زمین لاپتہ رہی)

علیم اللہ حالی صاحب کی اس رائے کے پہلے حصہ سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ حنیف ترین نے کہیں بھی ہیئتوں کو روندنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ہاں انھوں نے غزل کے ایک نئے تجربے ''غزل نما'' پر ضرور خاصا کام کیا ہے اور اس نوایجاد صنف پر پورا مجموعہ ''کشف غزل نما'' کے نام سے شائع کیا ہے ان کے اس کام سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اس تجربہ کو رد کیا جا سکتا ہے مگر اسے ''ہیئتوں کو روندنے'' سے تعبیر کیسے کیا جا سکتا ہے؟ باوجود اختلاف کی گنجائش کے ان کی ''غزل نما'' میں کہیں کہیں اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ''غزل نما'' کے دو دو اشعار

سرخوشی کا اک بہانہ ہو گیا
وہ ملے، موسم سہانہ ہو گیا

جمع تنکے یوں ہوئے
اِک ٹھکانا ہوگیا!
مجھے تاریکیوں کا گھر نہ کہہ دینا!!
میں سورج کی طرح چھپ کر نکلتا ہوں
مری پہچان مشکل ہے!
میں روز و شب بدلتا ہوں

''غزل نما'' میں ہیئت کا صرف اتنا اختلاف ہے کہ غزل کے ہر شعر میں ارکان کی تعداد مختلف ہوسکتی ہے مگر شعر کے دونوں مصرعوں میں ارکان کی تعداد برابر ہوتی ہے......

حنیف صاحب کا قلم ابھی رواں دواں ہے اور ماشاء اللہ وہ نوجوان ہیں اس لیے شعرو ادب کو ان سے بہت سی توقعات ہیں اور جس رفتار سے ان کے مجموعے منظرِ عام پر آرہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مستقبل روشن ہے۔

جہاں تک حنیف ترین کے زبان و بیان اور فن کا تعلق ہے تو اس حوالے سے بھی ان کے یہاں گرفت کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے۔ انھوں نے اپنی محنت مطالعہ اور مشق سے زبان و بیان پر اتنی جلد وہ قدرت پالی ہے جو بعض شعرا کے یہاں ۴۰/۵۰ سال کی مشق کے بعد بھی دیکھنے کو نہیں ملتی.... پھر بھی ان کے یہاں کہیں کہیں شاید وہ بھی نظر بد سے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ محل نظر مقامات مل جاتے ہیں۔ اگر وہ ان پر بھی ذرا سی توجہ فرمائیں تو آئندہ یہ مقامات بھی ڈھونڈے نہ ملیں گے۔ مثلاً یہ شعر:

ہم لے کے بے امانی کو جنگل میں آگئے
دل کو جو شہرِ خوباں میں کچھ وسوسے لگے

مندرجہ بالا شعر کے مصرع میں لفظ ''بے امانی'' میں حرف علت کا سقوط۔ دوسرے مصرع میں ''شہرِ خوباں'' میں ''ن اور الف'' دونوں کا سقوط شعر کو کمزور کرتا ہے ''خوباں'' یہاں ''خوب'' رہ گیا۔ یہ شعر دیکھیں:

دریا سوکھا جو میرے آنسو کا
آنکھ صحرا تھی زرد بالو کا

پہلے مصرع میں ''دریا'' کے الف کا سقوط بھی نادرست ہے۔

ان کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے:

یہ عہد ہے خود کو ڈھونڈھنے کا
سراب ہستی کو گوندھنے کا

اس غزل کے بقیہ اشعار کے قوافی ہیں "بھولنے، ٹوٹنے، اوبنے، یہ سب قافئے غلط ہیں گویا پوری غزل بغیر قافیہ ہے۔ ایک شعر اور دیکھیں:

شب زمستاں میں یادوں کے دانت بجتے ہوئے
تھی خامشی کے جہاں کو اذان کی خواہش

یہاں پہلے مصرع میں لفظ "زمستاں" اپنے صحیح وزن میں استعمال نہیں ہو سکا۔ اور "زمست" ہو کے رہ گیا۔

بہرحال ان معمولی تسامحات سے قطع نظر جناب "حنیف ترین" کا شعری سفر تیزی کے ساتھ صحیح سمت میں جاری ہے۔ یقین ہے وہ جلد مزید نئے سنگِ میل قائم کریں گے اور اپنے اشعار کے گل بوٹوں سے گلشن اردو کا دامن زرنگار کرتے رہیں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

عالم خورشید

ڈاکٹر حنیف ترین کی شاعری

اپنے خیالات و محسوسات کے اظہار کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کوئی بات اس طرح کہی جائے کہ سننے والے کے دل و دماغ پر فوراً اور براہ راست اثر ہو، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ گفتگو اس انداز سے کی جائے کہ بات کو ذہن و دل کے توسط سے رگ و پے میں اترنے میں نسبتاً زیادہ دیر لگے، لیکن جب اتر جائے تو نکلنے کا نام نہ لے۔ ڈاکٹر حنیف ترین شاعروں کی دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے میں یقین رکھتے ہیں۔ لہٰذا شعوری طور پر بھی بحر و اوزان لے کر قافیہ اور ردیف کے انتخاب میں حتی الامکان یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی شاعری عام روش سے الگ دکھائی دے۔ ان کی شاعری راست انداز میں گفتگو نہیں کرتی بلکہ شعری لوازمات کے ساتھ گھل مل کر سماعت کے پردے پر کبھی سرگوشیاں کرتی ہے تو کبھی دستک دیتی ہے۔ شاعری کا یہ انداز اچھی شاعری کا خاکہ مانا جاتا ہے۔

حنیف ترین اردو شاعری کا ایک جانا پہچانا نام ہے اور یہ نام گذشتہ دو تین دہائیوں سے اہلِ ادب اور قارئین کے ذہن و دل پر لگاتار دستکیں دے رہا ہے۔ ان کی غزلیں/نظمیں ملک اور بیرونِ ملک کے اردو رسائل میں تواتر سے شائع ہو رہی ہیں اور ان کے کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں، جو متوجہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ''زمین لاپتہ رہی''، نظموں اور غزلوں پر مشتمل ان کا تازہ مجموعہ کلام ہے جو نہایت نفاست سے شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر حنیف ترین ادب کے ڈاکٹر نہیں ہیں بلکہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور اپنے ملک سے دور عرعر میں مقیم ہیں۔ ان کا ایک المیہ تو یہ ہے کہ وہ اپنی مٹی سے محروم ہو کر غیر ملک میں مہاجر کی زندگی گزار رہے ہیں لیکن ان کے ساتھ دوسرا بڑا المیہ یہ ہے کہ جب وہ اپنے وطن واپس آتے ہیں تو یہاں کے بدلتے ہوئے حالات، ٹوٹتے ہوئے اقدار اور نامساعد صورتِ حال کو دیکھ کر انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ جس مٹی کے وہ اسیر ہیں، جس آب و ہوا میں وہ پلے بڑھے ہیں اور جس خوشبو کے وہ غیر وطن میں متلاشی رہتے ہیں وہ خوشبو ان کی اپنی زمین سے بھی عنقا ہوتی جا رہی

ہے۔ محرومی کا یہی کرب حنیف ترین کی شاعری کا محور ہے۔ اس پس منظر میں ان کا تازہ شعری مجموعہ ''زمین لا پتہ رہی'' ایک استعارہ بن جاتا ہے جو نہایت معنی خیز ہے۔

حنیف ترین حساس دل کے مالک ہیں۔ انسانیت کے جذبے سے لبالب ہیں۔ بدلتے ہوئے عہد اور اقدار کی شکست و ریخت پر نظر جمائے رکھتے ہیں۔ زندگی اور مسائل پر غور و خوض کرتے رہتے ہیں اور اپنے محسوسات و خیالات و افکار کو بڑی آسانی سے شعری پیکر میں ڈھالنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ تجربات و مشاہدات کے لیے انھیں ایک بڑا کینوس حاصل ہے۔ اچھی شاعری کے لیے اس سے زیادہ اور چاہیے بھی کیا؟ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ان کی شاعری کا خمیر وطن کی مٹی میں رچی بسی اس خوشبو سے تیار ہوا ہے جس کی محرومی غیر ملک میں نہیں اپنے وطن میں بھی انھیں ستاتی ہے اور ان کی شاعری اسی محرومی کا نوحہ ہے لیکن اس کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ حنیف ترین کی شاعری مایوسی، بے یقینی اور زندگی سے فرار حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ وہ فطرت کے خوبصورت مناظر سے حظ اٹھاتے ہیں، خوشی کے لمحوں سے سرشاری بھی حاصل کرتے ہیں اور زندگی کے مثبت پہلوؤں پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ یہ ساری خصوصیات ان کی شاعری میں بھی جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ وہ حالات کے شکست و ریخت سے اداس تو ہوتے ہیں کبھی کبھی مایوس بھی دکھائی دیتے ہیں مگر حالات کے آگے سپر نہیں ڈالتے، انسانیت سے ان کا بھروسہ نہیں اٹھتا اور ان کے اندر رجائیت کی کوئی کرن اچانک چمک اٹھتی ہے جس کی روشنی میں وہ پھر پورے اعتماد کے ساتھ اپنے سفر پر رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل تین حوالے اس بات کی تصدیق کریں گے کہ شاعر حالات سے کس طرح متاثر ہوتا ہے اور اس پر حالات کا کیا ردعمل ہوتا ہے؟

(۱) خوف کی دیمک
بے دردی سے
اجلی نیند کو
چاٹ رہی ہے
دھوپ میں
ظلمت بانٹ رہی ہے (ایک نظم)

(۲) کبھی مت چھوڑ تو امید کا دامن
ہمیشہ ڈوب کر سورج نکلتا ہے

(۳) تیری زبان کو کیا ہوا یہ کیوں خموش ہے
تیرا ضمیر مرگیا تو خودی فروش ہے

حنیف ترین کی شاعری اداسی و مایوسی کے اندھیرے میں زندگی کی روشنی تلاش کرنے تک ہی محدود نہیں ہوتی، چونکہ انھوں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں۔ لہٰذا قومی اور بین الاقومی سطح پر ہونے والی سیاست اور اقتدار و دولت کی ہوس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سازشوں سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں، جس کا اظہار ان کی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے ہوا ہے، مثلاً ان کی ایک غزل کے یہ تین اشعار۔

جواب کیا رہا اس کی نیاز مندی کا
پڑا ہو دورہ نیا جس کو خود پسندی کا

جو چاہتے تھے ملے ربط باہمی کو فروغ
انہی پہ آگیا الزام شر پسندی کا

خود اپنا صید ہے وہ گرگ باراں دیدہ حنیف
نشہ تھا جس کو بہت اپنی پیش بندی کا

زندگی چاہے جتنی بھی سنگین ہو جائے، حالات چاہے جتنے بھی خراب ہو جائیں، نفرت کی سیاست چاہے جتنی بھی ہولیاں کھیلے مگر انسان کے دل میں محبت کا جذبہ کبھی مر نہیں سکتا۔ محبت کے ان گنت روپ ہیں اور ان میں ایک روپ وہ بھی ہے جو غزلیہ شاعری میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ موجودہ دور میں صنفِ غزل نے اپنے دامن میں ہزار رنگ جلوے سمیٹ لیے ہیں مگر آج بھی اس کے سینے میں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ایک عاشق کا دل دھڑکتا ہے۔ اس دل کو حنیف ترین نے بھی زمانے کی آلودگیوں سے بچائے رکھا ہے، جو انھیں اس طرح کے اشعار کہلواتا ہے۔

بال کھولے کس نے یہ صحراؤں میں
اُمڈیں ہر سو کالی کالی بدلیاں

تمھیں جب ڈسے کبھی چاندنی، مجھے پڑھنا تم مجھے لکھنا تم
کبھی چھائے جب گھٹا جامنی، مجھے پڑھنا تم مجھے لکھنا تم

اس کے بدن کی پاگل خوشبو
اپنے پروں پر مجھ کو اڑائے
چاروں دشا کی سیر کرائے
رات جگائے
دن سلگائے

(خواہش بازو پھیلاتی ہے)

فکر کی برہم جھم سوچ کا جادو
کاغذ، رنگ، قلم اور خوشبو
تجھ کو کب سے ناپ رہا ہوں

(تجھ کو لکھنا آسان کب تھا)

حنیف ترین بے حد موزوں طبع ہیں اور شاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائیاں کرتے رہے ہیں۔ ''زمین لا پتہ رہی'' ان کی نظموں، غزلوں اور آزاد غزلوں پر مشتمل شعری مجموعہ ہے۔ انھوں نے مختصر نظمیں بھی کہی ہیں اور طویل نظمیں بھی۔ ان کی غزلیں، نظمیں ان کی تخلیقی قوت اور فنی بصیرت کا ثبوت ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ وہ مختلف اصناف سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ زبان و بیان کی پیچیدگیوں اور بحر و اوزان کی نزاکتوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ مگر یہ دونوں خوبیاں ان کی راہ میں رکاوٹیں بھی کھڑی کرتی ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے کے دوران مجھے اکثر ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے یہاں شعری اور تنقیدی حسیں ہمیشہ ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتی ہیں کہ کسے اولیت حاصل ہے۔ ان کے اندر کا شاعر ان دو قوتوں کے درمیان تذبذب کا شکار رہتا ہے اور اکثر و بیشتر شعری حس پر تنقیدی حس غالب ہو جاتی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فنی لوازمات کو برتنے کی کوشش میں بہت زیادہ شعوری چوکسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تخلیق کی بے ساختگی کی چمک ماند پڑ جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے۔ تنقید یا عروج کے آلات کا زیادہ استعمال شعر کے اس فطری خط و خال کو ابھارنے کی جگہ مسخ کر دیتا ہے جس سے دلکشی اور

انفرادیت کے عناصر پیدا ہوتے ہیں۔اس شعوری عمل سے بے ساختگی کی جگہ تصنع پیدا ہوتا ہے، جس سے اشعار کی پرواز میں رخنہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح کے اشعار تخلیق ہونے کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔

نیک و بد میں کوئی تمیز نہیں
یہ زمانہ بھی کیا زمانہ ہے

ایسے الجھایا مجھے حالات نے
تجھ کو سوچے بھی زمانہ ہو گیا

مختصراً یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ "زمین لاپتہ رہی" ایک کامیاب شعری مجموعہ ہے جو ڈاکٹر حنیف ترین کے شعری سفر کے بتدریج آگے بڑھنے کی بشارت دیتا ہے۔ ان کی شاعری فکر وفن کے اس امتزاج کا خوبصورت نمونہ ہے جو رفتہ رفتہ معدوم ہوتا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر حنیف ترین بھی اپنے شعری سفر پر تیز رفتاری سے مائل ہیں۔ ان کے پاس ابھی کہنے کو بہت کچھ باقی ہے اور کہنے کا حوصلہ بھی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ آنے والے دنوں میں ان کی شاعری مزید آب وتاب کے ساتھ اپنی روشنی بکھیرے گی۔ میں دعا گو ہوں کہ وہ اسی تیور کے ساتھ اپنے شعری سفر پر مدتوں رواں دواں رہیں۔

حنیف مجھ کو ذرا قہقہہ لگانے دو
کہ زندگی کی حقیقت بیان ہوتی ہے

☆☆☆

احمد ندیم قاسمی

مدیر سہ ماہی فنون، لاہور (پاکستان)

●

حنیف ترین کی شاعری نیچر اور انسانی زندگی کے ازلی و ابدی ارتباط و امتزاج کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ ان کی نظم اور غزل میں کم ہی ایسے مقامات وارد ہوتے ہیں جو اس کیفیت سے محروم ہوں ورنہ ان کی تمام شاعری آسمان اور زمین، فطرت اور انسان، ماورائیت اور حقیقت کے ملاپ کی نمائندہ ہے۔ حنیف ترین کی بیشتر نظمیں مختصر ہیں جن میں انھوں نے جذبہ و احساس کے کسی نہ کسی تاثر کا اظہار نہایت فن کارانہ اجمال کے ساتھ کیا ہے۔ مگر جہاں ان کے ہاں مختصر نظموں کی اکثریت ہے وہیں انھوں نے خاص طویل نظمیں بھی کہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان نظموں میں بھی ان کے فن کی کلیدی خوبی، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، پوری طرح اجاگر ہے۔ ان کی غزل مفہوم اور لفظیات، دونوں کے لحاظ سے جدید بھی ہے اور اس روایت سے بھی اس کا رشتہ استوار ہے جس نے اس خوبصورت صنفِ سخن کو ہمیشہ زندہ رہنے کی توانائی بخشی ہے۔

✡✡✡

محمد حسن

●

موجودہ دور میں جب اردو ادب مائل بہ زوال ہے حنیف ترین کا کلام دلکش اور قابل تحسین ہے۔ یقیناً آج ان کی آواز اردو شاعری کے جدید دور میں ایک منفرد آواز بن کر ابھر رہی ہے۔ اس سے جدید ذہنوں میں ایک نیا رجحان پیدا ہونے کی قوی امید ہے۔ زیادہ تر جدید شعراء جب اپنی ذاتی نامرادیوں اور جنسی محرومیوں کا رونا رو رہے ہیں اور اردو شاعری کو اندھیروں کی طرف دھکیل رہے ہیں حنیف ترین نے قدروں کی نئی شمع جلا کر تھوڑا بہت اس اندھیرے کو دور کیا ہے۔ نظمیں جاندار قدروں کی حامل ہیں اور آپ نے ان قدروں کو اپنے وجود میں سمو کر ایک نئے لہجہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مسلسل غزلوں میں بھی یہی تاثیر پوری طرح سموئی ہوئی ہے۔ اردو شاعری کی پوری روایت کا احترام کرتے ہوئے اسے جدیدیت کا رنگ دے کر

آپ نے اپنی شاعری کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ اردو دنیا میں ان کا یہ مجموعہ سراہا جائے گا۔ اس کی بھی قوی امید ہے کہ اردو شاعری کا وقار پھر سے قائم ہوگا اور حنیف ترین کی شاعری کو نمونہ بنا کر جدید شعرا اسی ڈگر پر چلیں گے۔ کچھ اردو جریدوں نے جدید ذہن کو حسیت کی گمراہی ضروردی ہے مگر مجھے امید ہے کہ وہ اس گمراہی سے ضرور نکلیں گے۔ حنیف ترین نے ذاتی کرب کے دائرے سے نکل کر کائنات کی وسعت کا احاطہ اکثر و بیشتر اپنی مختصر و طویل نظموں میں کیا ہے۔ یہ تجربہ بہت ہی کامیاب رہا ہے۔ وہ اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔

حنیف کی شاعری پر مبصرین نے بہت کچھ لکھا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ میں حنیف ترین کو ان کی کامیاب تخلیق پر مبارکباد دیتا ہوں۔

✡✡✡

شمس الرحمٰن فاروقی

الٰہ آباد

حنیف ترین کی شاعری نے گذشتہ دس بارہ برس میں ترقی کی منزلیں سر کی ہیں۔ ابتدا میں ان کی شاعری میں کسی بچے کی سی معصومیت بلکہ سادگی تھی۔ شاعر کو دنیا کی پیچیدگیاں، مایوسیاں، دشمنی دوستی کے مسائل، انسان کی امیدیں اور خوف، کائنات کی وسعت میں اس کی بے چارگی، ان باتوں کا احساس تو تھا، لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنا احساس یا اپنا تجربہ اور دنیا سے اپنی نارضامندی صاف صاف لفظوں میں ظاہر کر کے مطمئن ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ شاعر کی نظریں فوری حقیقت کے آگے دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتیں۔ حالانکہ اصل حقیقت نہ تو آنکھوں کے سامنے ہے اور نہ ہی شاعر کے وجود کا کوئی اور جواز ہی ہے۔ سوا اس کے کہ وہ اصل حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے۔

شاعر کی نگاہ ظاہر میں نہیں ہوتی، بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ شاعر وہ ہے جو ظاہر کو ترک کر کے ہر تصور، ہر تصویر، ہر تخیل کے باطن کو مشاہدے میں لائے، ہر سطح کی گہرائی کو پایاب بنائے اور ہر واقعے کے پیچھے جا کر اس کے عوامل و محرکات کو دیکھے اور ہمارے لیے اسے بیان کرنے کی کوشش کرے۔ شروع شروع میں حنیف ترین کی شاعری نے محسوسات کی شدت اور حقائق

حیات کے سامنے کرب بھرے ردِّ عمل کی بنا پر اپنے لیے ایک تشخص حاصل کر لیا تھا اور ہم سب کو خوشی تھی کہ جدید شاعروں کی صف میں ایک توانا آواز کا اضافہ ہو رہا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ شاعری صرف شدت احساس اور دردمند ردِّ عمل کو نظم کر دینے کا نام نہیں ہے۔ شاعر کو بیک وقت دنیا سے بھی معاملہ کرنا پڑتا ہے اور لفظ سے بھی۔ دنیا خود ہی بڑی ظالم اور پُر اسرار اور اجنبی قوت ہے اور شاعر کی حسیّت کو وہ عام طور پُر ناپسند کرتی ہے۔ اب رہے لفظ، بظاہر دنیا کی طرح ظالم اور پُر اسرار اور اجنبی نہیں ہیں۔ لفظوں کو مرتب اور منظم کر کے ان کے ذریعہ اپنے تشخص کو تازہ وجود دینے کے معنی ہیں لفظوں کی اجنبیت کو ختم کرنا، انھیں دوست بنانا، ان کی نزاکتوں اور لطافتوں اور معنویتوں سے آگاہ ہونا اور اس کام میں وہی شاعر کامیاب ہوتا ہے جو لفظ کا احترام کرے اور جسے معلوم ہو کہ اس کے پیش رووں نے لفظ کو مسخر کرنے کے لیے کیا ترکیبیں استعمال کی ہیں۔

حنیف ترین انھیں خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جو اپنی شاعری میں دنیا کی پیچیدگی، گہرائی، اجنبیت، ظلم وستم، حیرت وانبساط کو الفاظ کے ذریعہ کاغذ پر لے آتے ہیں۔ لفظ اب ان کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ ان کے مجموعہ ''زمین لاپتہ رہی'' میں آج کی دنیا کبھی ماضی کے لطیف رنگوں میں لپٹی ہوئی اور کبھی حال کی درشت روشنی میں سہمی ہوئی سی نظر آتی ہے لیکن ہر حالت میں اس کے وجود اور اس کی اصلیت کو الفاظ میں ڈھال کر کاغذ پر سجا دینے میں حنیف ترین کو کچھ مشکل نہیں ہوتی۔ وہ احساس سے آگے جا کر مفکرانہ مشاہدے کی منزل میں رواں ہیں۔

نکل کر تیرگی کے دائروں سے
دورِ غم عجب رخشندگی ہے

ہے باہر بھی اسی کی زہر ناکی
نشہ مجھ میں جو پھن پھیلا رہا ہے

ساتھ لے کر زمیں کا شور چلیں
آیئے آسماں کی اور چلیں

رہ نوردی کے چمکتے موڑ پر
دھول مٹھی بھر اُڑانی اور ہے

پانی نے جسے دھوپ کی مٹی سے بنایا
وہ دائرہ ربط بگڑنے کے لیے تھا

منہ زوریاں مجھ سے ہی سزاوار تھیں اس کو
پھیلاؤ جہاں اس کا سکڑنے کے لیے تھا

✪✪✪

پروفیسر عنوان چشتی (مرحوم)

●

حنیف ترین کا اپنی شاعری میں جو جمالیاتی ردِ عمل ہے اس کو اگر ہم متعین کریں یا اس کی شناخت کی کوشش کریں، جو ان کی شاعری سے بخوبی ہو سکتی ہے تو پھر مجھے عرض کرنے دیجیے کہ ان کے یہاں جو انفرادیت ہے اس سے ان کے بہت سے بلند قد ہم عصروں کا دامن بھی خالی ہے۔

ان کی انفرادیت کے سلسلے میں اگلا سوال یہ ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ میرے ناقص مطالعے کی حد تک ان کی شاعرانہ شخصیت کا سب سے اہم اور بنیادی وصف تو یہ ہے کہ انھوں نے روایت سے روشنی حاصل کی ہے جو ان کی طرز اظہار کا سب سے طاقت ور عنصر ہے۔ حنیف ترین کی غزلیہ شاعری فارسی تغزل کی طاقت ور ترین اردو روایت کے تسلسل کی اہم کڑی ہے، مگر روایت کے گہرے شعور اور تہہ نشیں اثرات کے باوجود انھوں نے روایت کے جبر کو قبول نہیں کیا ہے۔ روایت کے اس جبر کے خلاف انھوں نے خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر بغاوت کی ہے۔ اس لیے حنیف ترین کی پوری شاعری میں غزل کے روایتی تصور

حسن و عشق کا کہیں ہلکا سا پرتو بھی نظر نہیں آتا۔ غزلیہ اشعار میں ان کا یہ غیر روایتی انداز ہی اول سے آخر تک چھایا ہوا ہے۔ ذرا ان اشعار کو دیکھیے جو میری بات کی تائید کرتے ہیں مگر ان کی حیثیت صرف نمونے کی سی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ انداز اول سے آخر تک چھایا ہوا ہے۔

کھڑی رہیں بری آنکھوں میں چیختی نیندیں
وہ میرے خواب کے رستے میں آ گیا ہوگا

ظاہر ہے کہ یہ اندازِ بیان روایتی شاعری میں کہیں موجود نہیں۔ اس غیر روایتی غزلیہ انداز کو پھر دیکھیے۔

تجھے نہ چھین سکے یہ خطا ہماری ہوئی
تمام جگ میں ہمیں خود سے شرم ساری ہوئی

اردو شاعری میں پیش دستی کی روایت تو موجود ہے مگر حنیف ترین کے انداز میں جو بانک پن ہے اسے جارحانہ انداز کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ ان کی شاعری میں ان کے اندر کا پٹھان اپنے تمام تر جارحانہ مزاج کے ساتھ موجود ہے۔ اس شعر میں بھی جارحیت ہے جو روایتی اردو شاعری میں کہیں نہیں ملتی۔ محبوب کے جیتنے کی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر چھیننے کی بات اور اس میں ناکام ہونے پر شرمساری کا اظہار صرف ایک پٹھان ہی کر سکتا ہے جو سچا عاشق بھی ہے۔

حنیف ترین کے مزاج کی شتابیت سے ان کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے۔ ذرا اب اس شعر کو دیکھیے۔

وہ نرم و نازک، وہ روئی جیسا خیال اس کا
جو دل کے تاروں پہ مدتوں تک دھنا گیا تھا

اس میں تجزیے سے تحسین کی طرف مراجعت کر رہے ہیں۔ ان کے بیشتر غزلیہ اشعار شاعرانہ مجسمہ سازی کا بہترین نمونہ ہے۔ مگر اس میں بھی لفظ دھنا میں وہی جارحیت ہے جو ان کے شاعرانہ مزاج کا خاصہ ہے۔ جہاں تک مجسمہ سازی کا تعلق ہے، یہ کام وہی شاعر کر سکتا ہے جو ذہنی تصویروں کو استعاراتی صنم بنانے کی ہمت رکھتا ہو۔ ولی دکنی کے بعد یہ خوبی اور خوب صورتی سب سے زیادہ حنیف ترین کے یہاں ملتی ہے۔

✡✡✡

مظہرامام

●

ڈاکٹر حنیف ترین پیشے کے اعتبار سے معالج ہیں اور وجدانی و وہبی طور پر شاعر۔ اس لئے وہ انسان کی نبض پر ہی نہیں انسانیت کی نبض پر بھی ہاتھ رکھتے ہیں۔ شاعری ڈاکٹر حنیف ترین کے لئے گہرے ذوق وشوق بلکہ جنون کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ شعر کہتے ہی نہیں شعر جیتے بھی ہیں۔ شاعری ان کے لئے محض خیال آرائی اور لفظی بازی گری نہیں، وہ خواب کے نہیں، بیداری کے شاعر ہیں۔ زندگی کی حقیقتوں پر ان کی نظر گہری ہے، وہ اپنی شاعری کی ذریعے عالمگیر پیمانے پر پھیلی ہوئی بربریت، ناانصافی اور استحصال کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انسانیت کی محرومی اور دل شکستگی کا مداوا ڈھونڈتے ہیں۔ ان کے کلام میں وقت کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ انہوں نے اپنے اشعار کے لب ورخسار کو مقصدیت اورافادیت کے غازہ سے سنوارا ہے۔ وہ مہالکشمی پل کے اس طرف ہیں جہاں مجبوروں اور مقہوروں کی دنیا آباد ہے۔ اس طرح کی شاعری اپنی حدود رکھتی ہے اوراس کا مطالعہ انہی حدود کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے۔

ابھی ڈاکٹر حنیف ترین کے عشق کو کئی امتحانوں سے گذرنا ہے کیونکہ ان کا فن ان کے دل کا مزید لہو چاہتا ہے۔

✡✡✡

نصیراحمد ناصر

مدیر سہ ماہی تطہیر، میر پور (پاکستان)

●

یوں تو ہر اچھے شاعر کے ہاں لفظیات وشعریات کا علاحدہ نظام اور ایک انفرادی جہان معانی ہوتا ہے لیکن بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جو صحیح معنوں میں لفظوں کو نئے مفاہیم سے آشنا کر پاتے ہیں۔ ڈاکٹر حنیف ترین کا شماران معدودے چند شعرا میں کیا جانا چاہئے جنھوں نے لسانی تشکیلات اور نئی شعریات کا دعویٰ باندھے بغیر اپنی شاعری میں الفاظ کو نئی معنویت اور نئے طریق سے ہم کنار کیا ہے۔ حنیف ترین کی شاعری میں دھرتی کا طلسم اور انسانی ذات کے اسرار و

رموز یکجا ہوکر عرفان و آگہی کے دھاردار بہاؤ سے جا ملے ہیں۔ حنیف کی شاعری روایت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا دلکش مجموعہ ہے، اور اس نوع کی شاعری ناقدین ادب کی طرف سے کسی خاص لیبل کی محتاج نہیں ہوتی۔

✡✡✡

ڈاکٹر خلیق انجم

●

حنیف ترین کے تخلیقی تجربات کی بنیادیں بہت وسیع اور کشادہ ہیں۔ ان کی شاعری میں صرف ہندوستان یا برصغیر نہیں بلکہ پوری دنیا سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ حنیف ترین تازہ کار شاعر ہیں۔ وہ قلابازیاں کھا کر پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتے بلکہ خون جگر سے فن شعر کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ ان کی فکر میں جو جدت سانس لے رہی ہے وہ تخیل کی گل کاریوں سے نہیں بلکہ زندگی کے تپتے، بدلتے، رہگزاروں پر سینے کے بل چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ حنیف کے اظہار میں اپنی طرف متوجہ کرنے والا جو انوکھا پن ملتا ہے، ان کے اسلوب اور لہجے میں جو تازگی، شادابی، بے تکلفی، برجستگی، سلاست اور سادگی ہے وہ روشن اور واضح فکر اور خلوص سے پیدا ہوئی ہے۔ حنیف ابھی کم عمر ہیں اور ابھی ان کے تخلیقی سفر کا آغاز ہے، اگر شعر گوئی میں ان کی کوشش اسی طرح جاری رہی تو بہت جلد ایک صاحب لحاظ اور منفرد لب و لہجے کے جدید شاعروں میں ان کا شمار ہوگا۔

✡✡✡

مخمور سعیدی

سابق مدیر ایوان اردو، دہلی

●

ڈاکٹر حنیف ترین کا کلام میں نے پڑھا بھی ہے اور خود ان کی زبان سے سنا بھی ہے۔ انہوں نے نئی نئی زمینوں میں فکر و خیال کی تخم کاری کی ہے اور لفظوں کی ایسی فصلیں تیار کی ہیں جن سے تازہ دم تشبیہات و استعارات کی ایک انوکھی سگھند پھوٹ کر قاری یا سامع کے دل و دماغ

تک پہنچتی ہے اور اپنی جگہ بنالیتی ہے۔ حنیف ترین بلاشبہ ایک تازہ کار شاعر ہیں ان کے ہاں احساس واظہار دونوں میں ایک نیا پن ہے مگر اس نئے پن میں اجنبیت کا شائبہ بھی نہیں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حنیف ترین ایک لمبا ذہنی سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں اور ان کے حافظے میں ان کے پیشروؤں کے تجربات بھی محفوظ ہیں، انہوں نے اپنی الگ راہ نکالنے کی سعی کامراں کی ہے مگر پیشروؤں کے تجربات واکتسابات سے بے نیازی کو اپنا شیوہ نہیں بنایا ہے اور شاید یہی ان کی سلامت روی کی روشن دلیل ہے.....

✡✡✡

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

●

ڈاکٹر حنیف شاہ خان کا مجموعہ کلام "ربابِ صحرا" ملا۔ ورق الٹے تو یہ شعر سامنے آئے۔

ریت اڑنے لگی خیالوں میں
کس کا آیا خیال صحرا میں

اجنبی سے رہے شہروں میں حنیف
پنچھی ملتے ہیں گلے جنگل میں

انسانوں کی بستی میں آواز لگاؤ۔ کوئی سنے گا، کوئی اَن سنی کر دے گا۔ صحرا میں کوئی نغمہ چھیڑ دو۔ وہ دور تک آواز چلی جائے گی، بلکہ وہاں اس کی تکرار بھی سنائی دے گی۔ گویا تمہارے نغموں میں صحرا کی فضائیں بھی شریک ہو جائیں گی۔ پھر وہاں ایک ایک چیز اس کے کیف واثر سے مسحور ہوتی ہوئی معلوم ہو گی، شہروں کے بسنے والے اکثر ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے بھی نہیں لیکن صحرا کی ہر چیز دوسری سے ایک خاص ربط و تعلق رکھتی ہے گویا وہاں ہر ایک دوسرے کے مقام کو سمجھتا اور اس کا احترام کرتا ہے۔ لیکن ان معاملات کو دیکھنے اور ان کیفیات کو محسوس کرنے کے لیے حساس ذہن، زندہ دل اور نگاہِ بینا درکار ہے۔

ڈاکٹر حنیف، شاہ خان ترین کے نام کو دیکھتے ہی مجھے پیر خان ترین کمترین تخلص کا خیال آتا ہے۔ جن کے بارے میں حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے لکھا ہے۔

"بنا پر نوشتنِ میرؔ در تذکرۂ خود شاعرِ شان جلی المتخلص بروئی راچہ ولی راکہ دہی شاعریست از شیطان مشہور تر ہجو ہای رکیکہ بہ واجبی نمود۔"

کمترینؔ کا یہ مصرع توزبانوں پر جاری رہا ہے کہ:

ولیؔ پر جو سخن لائے اسے شیطان کہتے ہیں

حقیقتِ حال جو بھی رہی ہو، پیر خان ترین نے جس بات کو ناحق سمجھا اس کی تردید ی انہوں نے خود پر لازم کر لیا۔ ناحق کو ناحق ماننے کے باوجود کم لوگ ہوتے ہیں جو اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت کر سکیں، مجھے خوشی ہے کہ جناب حنیف شاہ خاں ترین کو مزاجِ انکساری کے ساتھ ساتھ اللہ نے یہ جرأت بھی عطا کی ہے، کہتے ہیں:

چپ نہ رہو، آواز اٹھاؤ

ڈاکٹر حنیف شاہ خان کو یہ خوش فہمی ہے کہ وہ

جو حق کے لیے جان ہتھیلی پہ لیے ہوں
ہم ایسے جری، قوم میں کمیاب نہیں ہیں

خدا کرے کہ ان کا یہ خیال صحیح ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمانہ حق گوئی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتا ہے، چنانچہ ڈاکٹر ترین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں:

جو حق پہ رہے ان کو ملے سنگ ہمیشہ
ظلمت سے اجالوں کی رہی جنگ ہمیشہ

حنیفؔ اک اپنا حرف حق
زمانے بھر کو کھل گیا

ڈاکٹر حنیفؔ شاہ خان کے سینے میں قوم کا درد ہے۔ دنیا میں جو ہو رہا ہے اس پر ان کی نظر ہے اور وہ جانتے ہیں کہ:

قوم دو وطن کی نظریں ہیں
پیروں اور جوانوں پر

ہر طرف باطل کی یلغار ہے۔ اپنی بے سروسامانی کا احساس ہے۔ اس لیے دعا کرتے ہیں کہ:

مرے خدا مجھے لڑنے کا حوصلہ دینا

واقعی یہ حوصلہ بڑی نعمت ہے۔ یہی زندہ قوموں کا اثاثہ ہے۔ بلکہ یہی قوموں کو زندہ رکھتا ہے۔ یہی ڈاکٹر حنیف شاہ کا محبوب موضوع ہے۔ "ربابِ صحرا" میں اس قسم کے اشعار بہت ملیں گے:

سیکڑوں منزلیں قدم چومیں
حوصلہ ساتھ دے اگر تنہا

ہو حوصلوں کی اگر ساتھ فوج میداں میں
اکیلی ذات بھی جمِّ غفیر لگتی ہے

حنیف شاہ خاں اس حوصلے سے مثبت اور تعمیری کام لینا چاہتے ہیں:

اپنی تہذیب کو مٹنے سے بچانے کے لیے
فکرِ تعمیر اگر ہو تو قلم چلتا ہے

محافظت کے بعد ترقی کی منزل آتی ہے اور دنیا میں ترقی وہی قومیں کرتی ہیں جو ایک حال پر مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں رہتیں طبیعت کا اضطراب ہی قوموں کو بہتری کی طرف لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نے خوب کہا ہے:

ہے جنوں خیز موسم
باتیں سمجھو ہماری

ڈاکٹر حنیف شاہ خاں ترین اپنی "باتیں" خاص و عام تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ یہ باتیں ہی ان کا مقصود اصلی ہیں۔ باقی باتیں تو محض بات بنانے کے لیے ہیں۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ کڑوی دوا کس طرح کھلائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں عوامی طبقے کی بول چال کو بھی اختیار کیا ہے۔ ان کو خاص و عام سب سے معاملہ رہتا ہے۔ ڈاکٹری کے اصولوں سے شاعری میں فائدہ اٹھا لینا ڈاکٹر حنیف شاہ خاں ترین ہی کا کام ہے۔

✡✡✡

ظفر ہاشمی

●

حنیف ترین کا شعری مجموعہ "رباب صحرا" تنہائی کا ایک ایسا ساز ہے جس کی لے سے کبھی آہ نکلتی ہے اور کبھی واہ، یعنی دخترِ صحرا کا پورا وجود "ربابِ صحرا" میں سمو دیا گیا ہے۔ مزید صاف ستھری کتابت، عمدہ طباعت اور نفیس کاغذ نے "ربابِ صحرا" کو دلکش بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی نے سعودی عرب کے ایک غیر معروف علاقے میں رہ کر اپنی فکر اور خیال کے البیلے نقش بنائے ہیں، جن میں بہت سے عوامل کار فرماں ہیں۔ خصوصاً لفظیات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔

مثلاً شبنم، شفق، رنگ، چاندنی، شجر، دھوپ، جنگل، دشت وغیرہ یہ تمام الفاظ عام فہم بھی ہیں اور اپنی اکائی بھی رکھتے ہیں اور مجموعی طور پر اپنے اظہار کے لیے ایسے پیکر تراشتے ہیں جن سے فکر کی نئی شکل سامنے آتی ہے۔ یہ فصل عام انسان کی بھی ہے اور خاص کی بھی۔ باطنی اور بیرونی بھی، خلوت کی بھی اور جلوت کی بھی، غم کی بھی اور نشاط کی بھی۔ وجود کی بھی اور لاوجود کی بھی، داخلی بھی اور خارجی بھی۔

حنیف ترین کے یہاں عصری حسیت کے علاوہ تخلیقیت کی کافی اپج بھی پائی جاتی ہے۔ اس لیے ان کے اکثر اشعار میں اس کی فراوانی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کے قافیے اور ردیف بھی قابل غور ہیں، گڑوتے رہنا، صدائیں بنجر، ہوائیں بنجر وغیرہ وغیرہ۔

لفظیات اور معنیات کے علاوہ اسلوبیات بھی اپنے بڑے تخلیق کار کی شناخت کا پتہ دیتی ہے۔

حنیف ترین بھی انہی نادر تشبیہات و ترکیبات کے ذریعے خود کو منفرد بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً روئی جیسا خیال، نیند کا کھیت، بدن کی روشنی، شب کی چوڑیاں، کچی دھوپ، کشت ساعت، چاندبانی، سازِ جدائی، غنچہ و شہناز ہیکلی کا بال کھولے رہنا۔ پہاڑوں کا ملن، شربتی آنکھ صحرائی حنا وغیرہ وغیرہ۔

حنیف ترین کو منفرد بنانے کے لیے یہ کچھ اشعار اہم ہیں۔ آپ بھی دیکھیے اور سوچیے۔

مصیبتوں کو مرے گھر کا جب پتا دینا
مرے خدا مجھے لڑنے کا حوصلہ دینا

فضا کے خوف سے احساس سرد ہیں جن کے
انہیں کڑی سے کڑی دھوپ کی سزا دینا

قید میں عمر بسر ہو تو قلم چلتا ہے
پابہ زنجیر سفر ہو تو قلم چلتا ہے

بکھر گیا وہ سراب خوشبو حنیفؔ آخر
خیال صحرا کی ریت سے جو بنا گیا تھا

بوسیدہ اچکنوں میں چھپی آن بان ہوں
میں بھی کسی عروج کا مٹتا نشان ہوں

خواہش کے جنگلوں سے نکلتے ہیں کالے ناگ
تنہائی چھیڑ دیتی ہے جب نیم شب میں بین

رنگ برنگے موسم بانٹ
دھوپ اگا اور شبنم بانٹ

رونے دھونے والوں میں
سات سروں کے سرگم بانٹ

کشت ساعت میں امیدیں ہی نہ بوتے رہنا
جذبہ سعی و عمل کو بھی سموتے رہنا

کچھ ضد تھی ہواؤں کو اس پر بھی مگر ہم تم
بھڑکے ہوئے شعلوں کو شبنم سے بھگوتے تھے

بادشاہی ختم تو ہو دھوپ کی
ہو نہ جائے دودھ پانی دیکھنا

چاندنی کا تھا جال صحرا میں
یا تمہارا خیال صحرا میں

لوگ سیپ اور موتی اٹھالے گئے
ریگزاروں کا منظر مچلتا رہا

اٹھنے کے بعد لہروں کی وحشت سمیٹ کر
پانی پہ پھیلا دائرہ محدود ہو گیا

شاہد نہ تھا فرات شہادت کے باب میں
بکھرا شفق کا رنگ تو مشہود ہو گیا

اس کو چھوکر ہم تو حنیف
ٹھنڈی آگ سے گزرے ہیں

قید جنوں سے چھوٹو ورنہ زنجیروں کے ناز اٹھاؤ

یوں تو حنیف ترین کی تمام غزلیں ایک خاص رنگ و آہنگ کی ترجمانی کرتی ہیں اور انہیں ایک منفرد شاعر بناکر پیش کرتی ہیں۔ مگر خاص کر یہ غزلیں اپنے پورے وجود کے ساتھ منتخب کہی جاسکتی ہیں جیسے

حنیف ترین

تھوں میں ریت کی عجیب سسکیاں ہیں دور تک
سوار دھول پر ہوا کی ہچکیاں ہیں دور تک

بہا جو سوچ کا دریا تو صاف ہوتا گیا
رکا تو دائرہ انحراف ہوتا گیا

✡✡✡

ڈاکٹر صادقہ ذکی

●

کشت غزل نما ڈاکٹر حنیف ترین کی ایسی نئی غزلیات کا مجموعہ ہے جن میں غزل کے اشعار ارکان کی تعداد کے لحاظ سے طول وعرض میں مختلف نظر آتے ہیں۔ گذشتہ دور میں انھوں نے غزل کے سانچہ میں اس قسم کی تبدیلیوں کا تجربہ کیا ہے۔ حنیف ترین نے پہلے آزاد غزل لکھی اور پھر غزل نما۔ اس نوع کی غزل بظاہر جنگل کی آزاد پگ ڈنڈی کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ حنیف ترین کی غزلوں میں تجربات کی وسعت اور تازگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ان کی تخلیقی شخصیت نے کئی جغرافیائی اور تہذیبی خطوں کی مسافت طے کی ہے۔ نئی زمین پر قدم رکھنے والوں اور نئی ہواؤں کو لبیک کہنے والوں کو کئی طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً زبان وتہذیب کی اجنبیت، نئے سیاسی نظام سے مفاہمت، برعکس موسمی حالات اور ان کے علاوہ تنہائی کا احساس، وطن عزیز سے دوریاں، نازک اور گہرے رشتوں کے پیہم تقاضے وغیرہ۔ حنیف ترین کے کلام میں ایسے اشارے ملتے ہیں جو متفرق حالات سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان سے ان کی شخصیت کے تخلیقی ارتقا کی شناخت بھی قائم ہوتی ہے۔ متعلق بیک گراؤنڈ میں اس مجموعہ کے بعض اوراق اپنے قاری کو اس طرح متوجہ کر لیتے ہیں۔

ثمر ہمارے ضبط غم نے جو دیا
نئے افق میں بیج اس کا بو دیا
سر پہ رہتا ہے اب دھوپ کا سائبان

اتنا اونچا بنایا ہے ہم نے مکان
جس تتلی کے رنگ ہوا میں پھیلے ہیں
اس سے ہر بے رنگی کو میں ڈھانکوں گا
میں ہوں بے اماں رہ زندگی میں تمام عمر
مجھے چلنا ہے کبھی خار پر کبھی نار پر

یہ آواز شکست کی آواز نہیں ہوسکتی۔ زندگی کرنے کی صدا ہے۔ شاعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ ان کے پیش نظر جو مقصد ہے، وہ معمولی نہیں ہے۔ لیکن اس مقصد کے ساتھ نشاط کار کی فضا بھی نہیں ہے۔ پورے مجموعے میں غم تہہ نشیں کی ایک ٹھہری ہوئی کیفیت سامنے آتی ہے۔ اسے کسی جبر کا نتیجہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ ہر اس انسان کو پیش آنے والی ناگزیر صورت حال ہوسکتی ہے جو عام قول وفعل کی سرحد سے آگے جاکر عام بے رنگی کو ایک خاص رنگ دینا چاہے۔ یہ قید مقام سے گزرنے کا کرب بھی ہوسکتا ہے۔ اپنے وطن اور عزیز ترین رشتوں سے دور ہوکر انسان کیا کچھ محسوس کرتا ہے۔ اس قبیل کے چند شعر دیکھیے۔

فرصت کہاں کہ روئیں ترے انتظار میں
ہم کھوگئے ہیں دشت غم روز گار میں
کون ومکاں سے کچھ بڑھ کر
مرے دل کی لابی ہے
ملی جو حسرتوں کے بعد زندگی
مجھے لگی اک پتنگ کٹی ہوئی
شام فرقت ہے سحر آلام ہے
زندگی کا بس یہی انعام ہے

رباب صحرا اور کتاب صحرا کے بعد حنیف ترین کی اس کتاب میں موضوعات ومضامین کی خاصی کثرت نظر آتی ہے۔ ان اوراق میں مذہب تاریخ، صنعتی تہذیب، ایٹمی ماحول، جغرافیائی فضا اور حسن وعشق کی پرچھائیاں بیک وقت دیکھی جاسکتی ہیں۔ انھیں کسی پیچیدہ اور گہری بات کو سادگی سے کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ جس ملک میں آج کل قیام پذیر ہیں وہاں بجلی کی کثرت، اے سی اور تیز رفتار گاڑیوں نے صحرا کی تاریخی تمازتوں کو کم کیا ہے۔ ممکن ہے ان کا تجربہ ایسا ہی ہو۔

بہر صورت صحرا، ریگ صحرا اور دھوپ کی علامتوں نے اکثر خوب کام کیا ہے۔

✡✡✡

اسرار الٰہ آبادی

●

"**کشت** غزل نما" ایک تجربے کی توسیع ہے۔ حنیف ترین کی "غزل نما"، "نثری غزل" سے ہزار ہا درجے بہتر اور اثر بخش ہے۔ اور شاعری کی حدوں میں ہے۔ "غزل نما" کے اشعار کا تاثر میرے دل و دماغ پر "فرد" کا سا ہوتا ہے گو اس میں وہ فضا اور مجموعی تاثر کی گونج پیدا نہیں ہو پاتی ہے، جو ایک اچھی صالح روایتی غزل سے ہوتی ہے۔ یہ بات خوشی کی ہے کہ آپ ان جدت پسندوں میں نہیں ہیں جو صرف فیشن اور چونکا دینے والی شاعری کو ہی جدید شاعری سمجھتے ہیں اور جن کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ کسی شعری تخلیق کے موضوع کے اچھے ہونے کے لئے اس کا نیا ہونا ضروری ہے جیسے اگر ان سے کہا جائے کہ "سورج مشرق سے نکلتا ہے" تو وہ اس حقیقت کو یہ کہہ کر جھوٹ، غیر اہم اور ادنیٰ بتا دیتے ہیں کہ اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ یہ فرسودہ ہے اس لئے یہ بے کار اور فضول ہے۔ لیکن اگر اُن سے یہ کہا جائے کہ "سورج سے مشرق نکلتا ہے" تو وہ اس جھوٹی بات کو جدید، کار آمد اور قابل داد سمجھتے۔

حنیف ترین ایسے جدیدیوں میں نہیں ہیں، یہ بات اچھی، تعمیری اور مفید ہے۔ قدرتی طور پر اشیاء کی جو حدیں ہیں آپ ان میں رہتے ہیں۔ یہ ترقی و کامرانی کی علامت ہے۔

✡✡✡

کاوش عباسی (کراچی)

●

حنیف ترین وجدان کے سلسلے کے ایک ذی نفس فرد ہیں ان کے پاس بھی قدرتی ودیعت ہے، صلاحیت ہے، شوق ہے، حسن کی جستجو ہے، زندگی کا پیغام ہے، آپ سے محبت ہے اور اپنی خوبصورت شاعری کی یہ دوسری پیشکش ہے۔

ان کی پہلی کتاب "رباب صحرا" میں زیادہ تر غزلیں شامل تھیں۔ جب کہ آج کا

موضوع سخن، ان کی دوسری کتاب ''کتاب صحرا'' تمام تر نظموں پر مشتمل ہے۔ ان کی یہ نظمیں ہمیں ایک ایسے شخص کی زندگی کا قصہ بتاتی ہیں جو بہت متحرک ہے، جس میں ترنگ زندہ ہے توانائی باقی ہے اور جس کی شاعری میں زندگی چوکڑیاں بھرتی ہے۔ ورنہ اردو شاعری میں ایسے شاعر بھی موجود ہیں جن کی شاعری میں زندگی مرچکی ہے اور ان کے ضمیر کو خبر بھی نہیں کہ وہ کب سے مردہ گوشت پر گزران کرر ہے ہیں۔ مبارک ہو حنیف ترین کو کہ وہ ایسی زندہ تر اور جگمگ شخصیت کے مالک اور ایسی ترنگ بھری مچلتی گنگناتی شاعری کے خالق ہیں۔

ڈاکٹر حنیف ترین کی نظموں میں جگہ جگہ بے حد عمدہ خیالات جگمگ کرتے دکھائی دیتے ہیں جیسے نظم '' آئینہ'' اور انھوں نے زندگی اور فکر و جذبہ کے ہر پہلو پر نظمیں لکھی ہیں جیسے:

صحرا میں زندگی گزارتے ہوئے انھوں نے صحرا کو اپنے متخیلہ میں جذب کیا ہے اور کئی نظموں میں اپنے ناسٹلجیا، اپنے وطن میں گزارے بچپن، لڑکپن کی یادوں کے پس منظر میں تپتے صحرا کا قابل داد جمالیاتی پیکر تراشا ہے جیسے نظمیں '' کچے آموں کے موسم میں'' اور ''یادیں''۔

حسن کی طلب وتلاش اور محبت کی نرم گرم اور میٹھی کڑوی سچائیوں پر ان کی نظمیں جیسے '' جب ہوا سیٹیاں بجاتی ہے''، ''ایک کڑوا سچ''، ''تتلی منظر اور ہم''، ''ایک سلگتا سوال''، ''ایک اور سلگتا سوال''، '' ساون رت'' اور ''ضرورت''۔ ان میں پابند نظم ''ضرورت'' ایک واقعی مکمل نظم ہے اور مجھے بہت پسند آئی ہے۔

مہاجرت، تنہائی اور زیاں کے احساس کو بیان کرتی نظمیں جیسے '' دور یہاں صحراؤں میں''، ''فراق سونے کے صحرا میں'' اور ''صحرا میں ساون کی یادیں'' جن میں ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر کا مہجور تڑپتا دل، پردیس کے ہر آرام وآسائش سے باغی، اپنی جدائی، جو اب ازلی جدائی بن چکی ہے، کے غم میں مستقل تڑپ رہا ہے۔

زندگی سے محبت، زندگی کی مشقت اور فکر کے کڑے پن کی نظمیں، جیسے '' جیون بھید کی بھاشا بھیا''، ''سوچ'' اور ''احتجاج''، نظم '' جیون بھید کی بھاشا بھیا'' ان کی ایک بہت خوبصورت اور مکمل نظم ہے۔

سائنسی ترقی کے غلط استعمال کو بے نقاب کرتی نظمیں جیسے ''ایٹمی جنگ''، ''جنوں کی چاہتیں کیا کیا'' اور '' کمپیوٹر کی لال بتی جل رہی ہے''۔

اس مجموعے میں ڈاکٹر حنیف ترین نے چار سطروں پر مبنی مختصر نظمیں بھی پیش کی ہیں۔

ان نظموں کو ہم غزلوں کے آزاد متفرق اشعار کی طرح نظمیہ ''فردیات'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور انھوں نے انہیں پیش بھی اسی طرح کیا ہے، جیسے غزلوں کے باب میں ''فردیات'' کو آخر میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان مختصر نظموں میں اکثر بہت دلکش، قطعی اور پراثر ہیں ''گھر کا شور''، ''کتابوں کا موسم''، ''خوابنا کی''، ''روشنی کی جھالر''، ''پھول کے موسم''، ''انتظار''، ''موسم بہار''، ''انجام زندگی''، ''المیہ''، ''عتاب شب''، ''جب وہ آرہا تھا''، ''رت جگے'' اور دیگر کئی۔

میں اردو شاعری کی ان محبوس و مقطوع مختصر نظموں کو جن کے نام بھی مقرر کر دیے گئے ہیں جیسے ہائیکو، ثلاثی اور اردو ماہیے اور جن کے اوزان و ماہیت کی بحث میں اردو ادب کے سیکڑوں، ہزاروں صفحے اور دقیقے بے دریغ صرف کردئے گئے ہیں اور کئے جارہے ہیں، کے مقابلے میں ڈاکٹر حنیف ترین کی ان آزاد مختصر نظموں یا نظمیہ فردیات کو بہتر و ممتاز سمجھتا ہوں اس لیے کہ ان کی کھلی، آزاد اور متنوع لے زندگی اور جذبات کی رنگارنگی سے قریب تر ہے۔ صرف ایک چھوٹی سی بات یہ کہ اگر یہ مختصر نظمیں یا نظمیہ فردیات عنوان کے بغیر ہوں تو زیادہ سبک، پراثر اور رواں محسوس ہوں گے۔

آخر میں ایک اور چھوٹی سی بات اور وہ یہ کہ ڈاکٹر حنیف ترین کی پہلی کتاب ''رباب صحرا'' کی طرح، اگر ان کی دوسری کتاب کا عنوان بھی ''کتاب صحرا'' کے بجائے، گنگناتا ہوا، دلوں میں نغمے جگاتا ہوا کچھ اور ہوتا تو یہ اس کتاب میں شامل نظموں کی شعری نغمگی سے زیادہ میل کھاتا، اس سے زیادہ انصاف کرتا۔

✡✡✡

خواجہ رحمت اللہ جری (کراچی)

●

جس طرح ماں باپ اپنے بچوں کو اپنے سامنے رینگتے، گھٹنوں کے بل چلتے، اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے، پھر اپنے قد کے برابر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، اسی طرح میں نے حنیف ترین کی شاعری کو دیکھا ہے اور یہ دیکھنے کی مدت تین چار سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔ شاید شاعری کی تاریخ میں ترقی کے درجات طے کرنے کی کم سے کم مدت ہے۔

ان کی شاعری کے تین دور ہیں، شروع میں ان کی شاعری میں اداسی کا رنگ چھایا ہوا

تھا۔ بعدازاں جب ہم دونوں عرعر میں کبھی کبھی ساتھ بیٹھ کر طے شدہ وقت میں غزلیں کہتے تھے تو ان میں کھل کر کہنے کی صلاحیت بڑھی اور وہ اپنے رنگ میں شعر کہنے لگے، یعنی ظلم و بربریت اور مغربی قوموں کی نئی تھوپی ہوئی اور تھوپی جانے والی۔ New Colonianism نئی حکمتِ عملی کے خلاف انھوں نے اپنے پیغامات کو موضوعِ سخن بنایا اور جب ان کی محنت رنگ لانے لگی تو ان کی وسعتِ نظر بڑھی اور اس تیزی سے بڑھی کہ روایت پر جدیدیت کا رنگ وخول چڑھنے لگا اور وہ عصری حسیت سے قدم ملانے لگے۔ اسی عرصہ میں عتیق احمد عتیق مدیر توازن کے ادبی دامن سے وابستگی نے عصری ادب سے ہمکنار کرانے میں سونے پر سہاگے کا کام کیا، نیز موصوف سے مشورۂ سخن کے ساتھ ان کی اصلاح وتوجیہات سے مستفیض ہوکر حنیف ترین اب آسمانِ ادب کی بلندیوں کو چھونے کے لئے پر تول رہے ہیں۔

حنیف ترین کے منفرد لہجے میں مظلومیت کی ترجمانی ہے، خارجی مشاہدات اور وارداتِ قلبی ہے، پھر شاعری کی نبض پر مکمل گرفت سے مترشح ہے کہ مستقبل میں ان کی ترقی کے قوی امکانات روشن ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

راشد انور راشد

●

حنیف ترین کو شاعری کے میدان میں قدم رکھے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے، لیکن اس قلیل مدت میں ہی انھوں نے اپنا اولین شعری مجموعہ پیش کرکے ادب سے اپنی گہری دلچسپی کا واضح ثبوت دیا ہے۔

حنیف ترین بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اس مجموعے میں غزل کے سوا کسی اور صنفِ شاعری کا موجود نہ ہونا اس کی نشاندہی کرتا ہے۔

حنیف ترین کے یہاں تجربوں کی گونا گونی نظر آتی ہے۔ ان تجربوں میں تہہ داری پیدا کرنا ان کا خاص وصف ہے اور بعض اوقات جب وہ خالص علامتی لہجہ اختیار کرتے ہیں تو ایسے اچھوتے شعر نکالتے ہیں کہ پیچ در پیچ معنی کی تہوں کو کھول کر دیکھنے سے ایک بالکل ہی نئی کائنات کا دیدار ہوتا ہے۔

دِیے کی روشنی سورج کے کام آئے گی
ہوا کے قتل کا جس روز فیصلہ ہوگا

☆☆☆
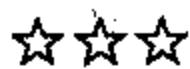
بوسیدہ اچکنوں میں چھپی آن بان ہوں
میں بھی کسی عروج کا مٹتا نشان ہوں

☆☆☆
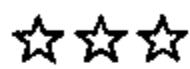
زخمی ہے نیند کس لیے چمکیلے خواب سے
ہر رات دن کے خون سے کیوں تر ہے ان دنوں

☆☆☆
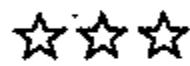
رنگوں کے رنگین جنوں میں چل کر حد سے پار نکل
لطف سوا ہو جاتا ہے جب درد کی دھار نکیلی ہو

حنیفؔ ترین کہیں کہیں اپنی ہمت اور بے باکی کا مظاہرہ کھلے عام کرتے ہیں اس قسم کے اشعار بلاشبہ ایک ایسے میلان کو انگیخت کرتے ہیں جو موجودہ وقت کا تقاضہ ہے:

کوئی بھی شے یہاں مانگے سے کب ملے گی حنیفؔ
جو تیرا حق ہے اسے چھین، کیوں جھجھکتا ہے

حنیفؔ ترین نے اپنی شاعری میں عام فہم الفاظ کو علامتوں اور استعاروں کے طور پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ بظاہر معمولی سے یہ الفاظ کافی وسیع کینوس رکھتے ہیں:

زمیں سے جس کو میں لایا فلک کی منزل تک
مرا وجود اسی آنکھ میں کھٹکتا ہے

☆☆☆

دل کی ڈالی پہ آرزو اس کی
پنچھیوں کی طرح چہکتی ہے

☆☆☆

سید قمر حیدر قمر

●
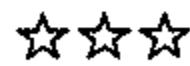
''**رباب صحرا**'' کے خالق حنیف ترین کی شاعری پتھر کے سینے کو چیر کر باہر نکل آنے والا وہ پودا ہے جو نرم و نازک ہونے کے باوجود اپنی بے پناہ قوتِ نمو کے بل پر پیدا اور ہویدا ہوتا ہے۔

حنیف ایک پرجوش و خوش خیال شاعر ہیں۔ ان کی فکر کے اکثر زاویے روشن امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ لیلیٰ کی ہم نشینی ملنے پر بھی محمل کے ہو کر رہ جانے والے عاشق نہیں ہیں۔ وہ شجر کے سائے کو ستانے کے لیے تو ٹھیک سمجھتے ہیں لیکن ان کے لیے وہ سایۂ شجر منزل نہیں بن سکتا۔

حنیف ترین زندگی کے شاعر ہیں، وہ زندگی جس میں دل بھی ہے، نگاہ ہے اور آہ بھی ہے اور کراہ بھی۔ کہکشائیں بھی ہیں، گپھائیں بھی ہیں، روشنیاں بھی ہیں اور جھلسا دینے والے شعلے بھی، ناہمواریاں بھی ہیں اور سفاکیاں بھی، نرمیاں بھی ہیں۔ وہ مسئلے کے ہر پہلو اور زخم کے محرک تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ منظر سے سرسری گزرنا انہیں منظور نہیں۔

طوق لٹکا ہے جو گلے میں مرے
اس کی ہر ایک کڑی کی بات کرو

حالات کی ستم ظریفیاں ان سے پوشیدہ نہیں، وہ ان ستم ظریفیوں کے اظہار میں بڑا صاف اور سیدھا لہجہ اختیار کرتے ہیں اور اس سیدھے لہجے میں گہرے دکھ کی آمیزش بھی کر جاتے ہیں۔

پیٹ کی خاطر بھرے سنسار میں
زندگی یوں کٹ گئی بیکار میں

ان کا یہ احساس غم جب کبھی تلخ تر ہوتا ہے تو ایسے روپ بھی اختیار کرتا ہے۔

کوئی بھی شئے یہاں مانگے سے کب ملے گی حنیف
جو ترا حق ہے اسے چھین کیوں جھجکتا ہے

اس انتہائی کیفیت سے گزرنے کا سانحہ آج کے انسان کا مقدر ہے، مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ اعلیٰ انسانی اقدار رکھنے والا ذہن تو آرائشِ حیات ہی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

رنگ و خوشبو کی ردا اوڑھ کے سرشار چلا ادھڑے منظر کو بچانے کے لیے خار چلا

حنیف ترین کی شاعری کو میں زندگی کا ایکسرے کہتا ہوں ایسے آدمی کا ایکسرے جو سماجی نا انصافیوں، ہلاکتوں، بیماریوں، تعصب، جہل و نفرت اور جبر و استبداد کے نشتروں سے زخم زخم ہے اور اس زخم زخم عالم میں بھی خوشبو رنگ آب جو، گیت، ساز، پھول اور شعر سے اکتساب تازگی کرتا ہے اور نامساعد کیفیتوں میں بھی زندہ و رخشندہ رہتا ہے اور یہی حنیف ترین کا اصلی کارنامہ فن ہے اور یہی وجہ ہے کہ خون آشام منظروں سے آگے ان کے یہاں ایسے لطیف اور اچھوتے جلوے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

چودھویں شب کے حسیں سرمئی ماتھے پہ حنیف
وہ بھی میری طرح چاند کو تکتا ہوگا

یا یہ اندازِ بیان۔

برخاب ہو چکے جو بکھرنے کے خوف سے اُن موسموں کو دھوپ کی یلغار چاہیے
مدت سے ہیں اُداس تمنا کی بستیاں ویرانیوں کو اب درو دیوار چاہیے

اور اس نیرنگیٔ خیال کو محسوس کریں جو انہوں نے سعودی عرب کے سنگلاخ صحرا سے لے کر صفحۂ قرطاس کی زینت بنادیا ہے۔

تیرے چہرے کا رنگ اُڑا لایا رات دن کا وصال صحرا میں
ریت اڑنے لگی خیالوں میں کس کا آیا خیال صحرا میں

اور حنیف کا یہ لہراتا، گنگناتا، جگمگاتا ہوا شعر ان کا شاہکار اظہار ہے۔

دل کی ڈالی پہ آرزو اس کی پنچھیوں کی طرح چہکتی تھی
دل دھڑکتا تھا سبز موسم کا چنری برکھا کی جب سرکتی تھی

✡✡✡

ماہنامہ کتاب نما کے چند خصوصی شمارے

کتاب نما
رشید حسن خاں
حیات اور ادبی خدمات
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
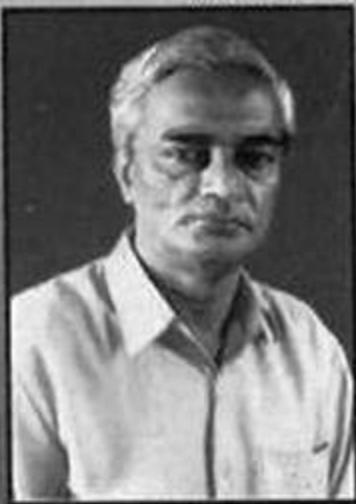
کتاب نما کا خصوصی شمارہ
خواجہ حسن نظامی
(شخصیت اور ادبی خدمات)

کتاب نما کا خصوصی شمارہ
مجتبیٰ حسین
(فن اور شخصیت)

کتاب نما کا خصوصی شمارہ
غلام ربانی تاباں
(شخصیت اور ادبی خدمات)

کتاب نما کا خصوصی شمارہ
شمس الرحمٰن فاروقی
(شخصیت اور ادبی خدمات)

کتاب نما کا خصوصی شمارہ
انیس نمبر
کتاب نما
۱۸۰۳ء — ۱۸۷۴ء
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

ڈاکٹر خلیق انجم
(شخصیت اور ادبی خدمات)

کتاب نما
(خصوصی شمارہ)

علی محمد خسرو
حیات و خدمات
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

خواجہ احمد فاروقی
(شخصیت اور ادبی خدمات)